پوٹھوہار
لوک کتاب
لوک ورثے کا قومی ادارہ

پوٹھوہار

عزیز ملک

لوک ورثے کا قومی ادارہ اسلام آباد ۔ پاکستان

ترتیب

OT.CS.7811.0ii
سلسلہ ثقافتی جائزے

دسمبر ۱۹۷۸ء

چیف ایڈیٹر۔ عکسی مفتی۔ ایڈیٹر۔ مظہر الاسلام۔
تلاش اور ترجمہ۔ عزیز ملک۔ کتابت۔ محمد اسلم جیمہ۔
سرورق : مسعود اختر

لوک ورثے کا قومی ادارہ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۸۴۔ اسلام آباد۔

شعبہ مطبوعات : قیمت : پندرہ روپے

یہ کتاب پاکستان کے اس علاقے کی روایات اور تاریخی تسلسل سے تعلق رکھتی ہے جسے پوٹھوہار کہتے ہیں۔ "پوٹھ" کا مطلب غیر ہموار" اور "ہار" کا مطلب جیسا" ہے اور یہ نام اس علاقے کے جغرافیائی ماحول کی عکاسی کرتا ہے کسی علاقے کا جغرافیائی ماحول وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، عمل اور کردار پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے بلکہ ثقافتی حوالے کی پہچان کے لئے دو چیزیں نہایت اہم ہیں جن میں سے ایک نظریہ اور دوسری آب و ہوا ہے۔

عزیز ملک نے اس کتاب میں پوٹھوہار کے فوک لور کی نظریاتی اساس کے حوالہ سے دراصل پاکستان کی نظریاتی اساس کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان ایک نظریاتی کل ہے اور اس کے تمام علاقوں کا رہن سہن روایات اور مزاج اس کل کے جزو ہیں جن کے پیچھے صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتی لوک روایات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے عزیز ملک نے ان لوک روایات کو تاریخ کے حوالے سے اور تاریخ کو ان لوک روایات کے حوالے سے پرکھنے کی کوشش کی ہے اسی لئے اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ لوک روایات تاریخ کا اہم حوالہ بنتی ہیں اور اکثر اوقات تاریخ کے حوالوں کو درست بھی کرتی ہیں۔ خاص طور پر ہمارے ہاں تو تاریخ کی ابتدائی صورت یہی لوک روایات ہی تھیں اور یہاں کی تاریخ لکھنے کی بجائے بھاٹوں کو زبانی یاد ہوا کرتی تھیں بلکہ جب البیرونی یہاں آیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ہمارے ہاں تاریخ لکھی نہیں گائی جاتی تھی اس نے لکھا ہے۔ یہاں مراثی اور بھاٹ ہوا کرتے تھے جو بادشاہوں، راجوں اور امیر لوگوں کے ساتھ رہا کرتے تھے اور انہیں ان کے شجرے

جنگوں کے حالات اور تاریخی قصے ازبر تھے اور وہ درباروں میں گا کر سنایا کرتے تھے"۔ حقیقت یہ ہے کہ جب دنیا کی تمام قوموں اور تہذیبوں کا ارتقاء ہوا تو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی ہوئی تاریخ اور روایات کو تحریر میں لایا گیا اور یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے فوک لورسٹ کا کام آنے والے دور کے تاریخ دان کا پہلا اور مستند حوالہ بنتا ہے اسی لئے یہ کتاب گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت واضح کرتی چلی جائے گی۔

اس کتاب میں عزیز ملک نے بذات خود روایات اور تاریخی حوالوں کے ساتھ سفر کیا ہے اور وہ کڑی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو روایات اور تاریخ کا نقطہ اتصال ہے اسی لئے کہ زبانی روایات کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ملک صاحب کو تاریخ کی کتابوں میں بھی جھانکنا پڑا ہے اور میرے خیال میں فوک لور کو صرف جمع کرنے کے بعد کی منزل یہی ہے کہ اس کا سنجیدگی سے تجزیہ کیا جائے اور اب لوک ورثے کا قومی ادارہ آہستہ آہستہ لوک روایات کو جمع کرنے کے بعد کی تجزیاتی فضا پیدا کر رہا ہے تاکہ فوک لور کی بحیثیت علم اہمیت واضح ہو سکے کیونکہ فوک لور دنیا کے تمام علوم کی بنیادی اکائی ہے۔ فلسفہ، سائنس، تاریخ اور دیگر علوم فوک لور سے پھوٹتے ہیں جب لکھے ہوئے لفظ کا وجود نہیں تھا اس وقت فوک لور ہی علم کا ذریعہ تھا۔ اور علم تھا اور موجودہ عہد میں فوک لور کا تجزیہ نہ صرف ہمعصر علوم میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے بلکہ اس کے مطالعہ سے قومی ہم آہنگی اور باہمی رشتوں کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ میرے خیال میں زیر نظر کتاب کا اہم پہلو یہی ہے کہ اس میں پاکستان کے ثقافتی جزو کا کردار پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ ملک صاحب نے خاص طور پر مسلمانوں کی یہاں آمد اور اسلام پر یقین نہ رکھنے والی قوتوں کے زوال کے اہم پہلوؤں پر بحث کی ہے اور قدیم روایات کے اندر سے پھوٹتی ہوئی نئی روایات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کی ابتدا دراصل حافظہ کی ابتدا سے ہوتی ہے یعنی پوٹھوہار کا وہ ابتدائی دور جو زمین کی گرفت میں آسکتا ہے اور جہاں تک انسان کی سوچ کام کرتی ہے ملک صاحب نے پوٹھوہار کی روایت اور تاریخ کا سرا وہیں سے پکڑا ہے اور اس علاقے میں بسنے والوں کے قبیلوں اور برادریوں پر بحث کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کی عسکری روایات، رہن سہن اور روحانی

فضا کا بھی جائزہ لیا ہے اور اگر غور کیا جائے تو دو باتوں کو اس علاقے کے فوک لور میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے ایک یہاں کی عسکری روایات اور دوسری یہاں کی روحانی فضا۔ جہاں تک عسکری روایات کا تعلق ہے یہاں کی بہادری پاکستان کے عوام کی اجتماعی بہادری کی اصل روح ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ روحانی بزرگوں کی تعلیمات کی روشنی بھی نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی حوالہ مرتب کرتی ہے۔ حضرت بری شاہ لطیفؒ کے روحانی فیض کا سلسلہ پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے اور شائد ہی پاکستان کا کوئی کونہ ایسا ہو جہاں سے لوگ حضرت بری شاہ لطیفؒ کے مزار پر حاضری دینے نہ آتے ہوں۔ آپ ایسے بزرگ ہیں کہ جن کی تعلیمات اور زندگی بھر کا عمل ہمیں ایک سوچ اور ایک جذبہ عطا کرتا ہے یعنی ایک مرکز اور یہ مرکز وہ نظریاتی مرکز ہے جہاں ہم سب کی پہچان ہوتی ہے۔ حضرت بری شاہ لطیفؒ کے علاوہ حضرت پیر سید مہر علی شاہؒ حضرت سید حیدر علی شاہؒ اور دوسرے بزرگوں کی زندگی اور عمل بھی ہماری وہ روایات ہیں جو ہمارے نظریاتی مرکز کو مضبوط بناتی ہیں۔

عزیز ملک ہمارے مُلک کے اہم ادیب اور انشاپرداز ہیں ان کی یہ کتاب فوک لور، تاریخ، سوشیالوجی اور انتھروپالوجی کے طالب علموں کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوگی۔

منظر الاسلام

وجہ تسمیہ

چینی سیاح ہیون سانگ ۶۳۰ء میں ٹیکسلا آیا۔ یہ شہر اُن دنوں وسطی اور مغربی ایشیا کو ہندوستان سے ملانے والی شاہراہ پر واقع سب سے بڑا اور گنجان آباد شہر تھا۔ اس نے دیکھا کہ زمینوں کی زرخیزی اور آب و گل و سبزہ کی فراوانی نے اس کی دلکشی میں چار چاند لگا رکھے ہیں۔ البتہ بدھ مت کی عبادت گاہیں ویران اور بعض بستیاں سونی پڑی تھیں۔

ہیون سانگ کی آمد سے پہلے کے آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح تک یہ خطہ سلطنتِ ایران کا حصہ تھا اور تہذیبی و تمدنی اعتبار سے اسے خاصی اہمیت حاصل تھی۔

تزکِ بابری سے پتہ چلتا ہے کہ بابر نے بھی اس خطہ کو جنگلات اور زرخیز زمینوں کا گہوارہ قرار دیا۔ اگرچہ مرورِ ایام کے باعث زمینوں کی زرخیزی اور شادابی کی وہ صورت اب باقی نہیں جو ماضیٔ بعید میں رہی ہوگی۔

پوٹھوہار نام کی مختلف توجیہات یہ ہیں:۔

پوٹھوہار کا لفظ پوٹھ اور ہار کا مرکب ہے۔ جو اصل میں پٹھ آر تھا۔ پٹھ پشت کو کہتے ہیں اور آر کے معنی ہیں مانند یعنی پُشت کے مانند۔

یہ نام اس سرزمین کی ظاہری ہیئت کا آئینہ دار ہے کیونکہ زمین اونچی نیچی اور ناہموار ہے۔ نشیب ہیں اور کہیں فراز۔ مسطح اور کہیں کوہان کی طرح ابھری ہوئی۔

تزکِ جہانگیری میں اس کی حدیں جہلم سے مارگلہ تک بیان کی گئی ہیں۔ محض بول چال کی زبان پر کسی علاقہ کی حد بندی کا انحصار کریں تو صرف سید کسران تک خالص پوٹھوہاری بولی جاتی ہے۔ اس کے بعد دھنی زبان شروع ہو جاتی ہے مگر علاقہ کی مماثل خصوصیات کو پیشِ نظر رکھیں تو کاہر د کبھی، پنڈی، دھنی اور گھیبی پوٹھوہار ہی کا حصہ ہیں۔

رُوحانی فضا

عسکری روایات کے سائے میں جس زرعی معاشرہ نے جنم لیا۔ وہ اپنے مخصوص ڈھب سے صدیوں پروان چڑھتا رہا۔ لیکن جب اس خطہ پر اسلام کی چھاپ لگی تو دیو مالائی تہذیب کا خاتمہ ہوگیا۔

سلطان محمود غزنوی کے لشکر کے ساتھ مختلف حملوں کے دوران بعض اولیائے کرامؒ بھی تشریف لائے۔ ان اللہ کے بندوں کا شاہی لشکر کی ہمراہی میں صرف اتنا ہی کام تھا کہ وہ اذنِ الٰہی پاکر مختلف مقامات پر تبلیغ حق کے لئے ٹھہر جاتے اور لشکر آگے بڑھ جاتا ــــ حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ بھی محمود غزنوی کے تیرہویں حملہ کے وقت ساتھ آئے اور دریائے راوی کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ اسی طرح محمود غزنوی کے ایک لشکر کے ساتھ حضرت سالار ساہوؒ اور ان کے چھوٹے بھائی سالار قطب شاہ غازیؒ تشریف لائے اور سون سکیسر کو مرکز بنا کر اعلائے کلمۃ اللہ کا فرض ادا کیا۔

غزنوی لشکر کے ساتھ گکھڑوں کے جو دستے آئے تھے۔ وہ گکھڑ شاہ کے ساتھ پوٹھوہار ہی میں فروکش ہو گئے اور انہوں نے پھروالہ کو اپنا مرکز بنالیا تھا۔ پھروالہ ہی میں حضرت داتا گنج بخشؒ گکھڑ شاہ سے آکر ملے۔ ظاہر ہے کہ یہ ملاقات دینی اور روحانی امور ہی سے متعلق ہوگی۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ خطہ روحانیوں کے باطنی تصرف کی بدولت منور ہوتا چلا گیا۔ ان اکابرین کے مزارات علاقہ بھر میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ عوام کو ان سے والہانہ عقیدت ہے اور عقیدت بلاوجہ

نہیں ہوا کرتی۔

ان بزرگانِ دین نے ایک روحانی فضا تخلیق کی جو تغیرات زمانہ کے باوصف آج بھی قائم ہے پوٹھوہار کے پس منظر میں چند اولیائے کرامؒ کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان حضرات کی تعداد تو کثیر ہے مگر تجسس کے باوصف مجھے بعض اکابرین کے تفصیلی حالات فراہم نہ ہو سکے۔ اس لئے جو کچھ میسر آیا خدمت میں پیش ہے۔
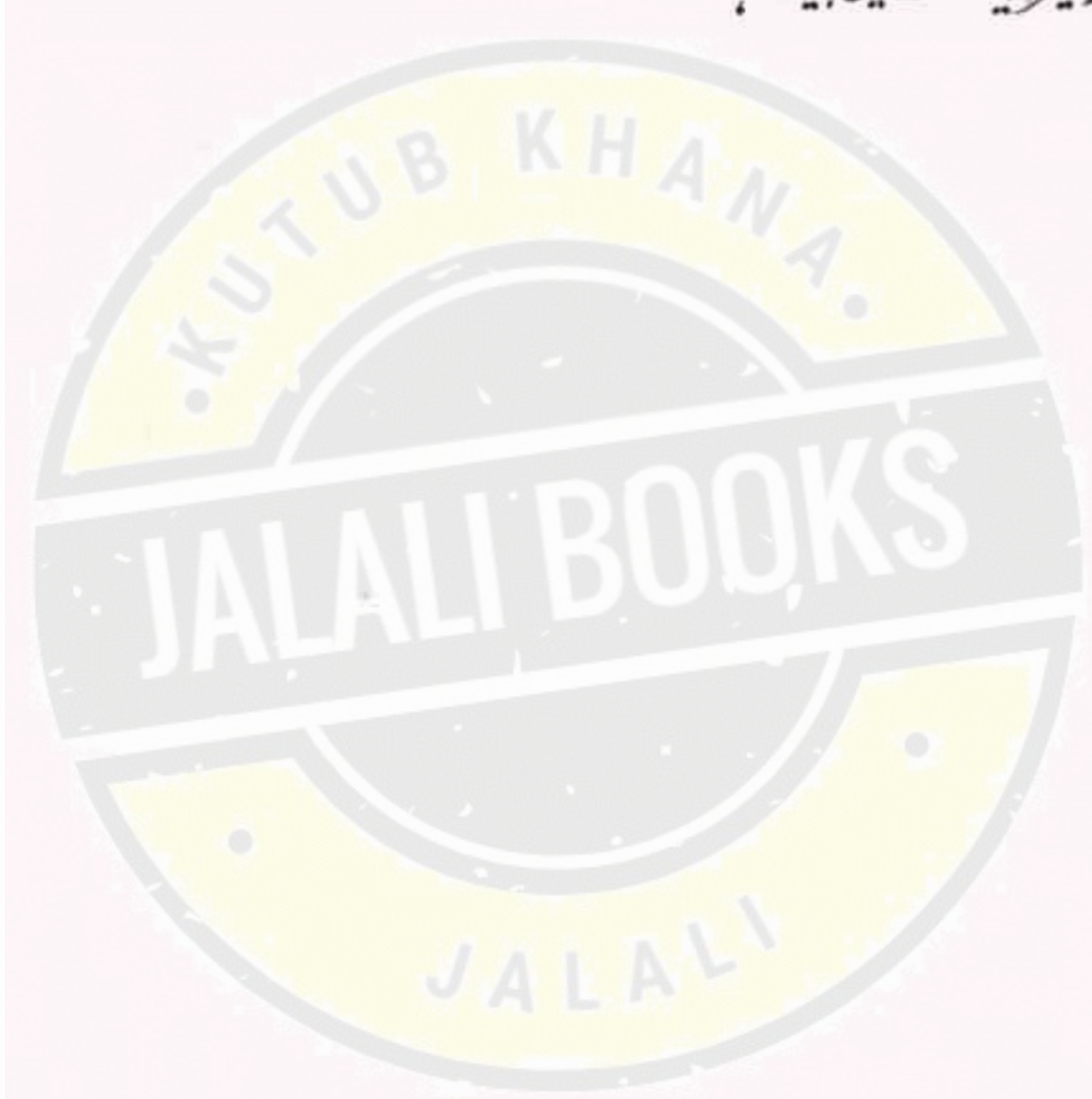
حضرت برّی شاہ لطیفؒ:

راولپنڈی سے ۱۴ میل دور موجودہ اسلام آباد کے ایک گوشہ میں کوہسار کے دامن تلے نور پور شاہاں ایک گاؤں ہے۔ آج سے تین سو برس پہلے ایک مردِ کامل حضرت شاہ لطیفؒ نے یہاں ندی کنارے گھنے درختوں کی چھاؤں میں ایمان وعرفان کی شمع روشن کی۔ خانقاہ کے علاوہ ایک مدرسہ قائم کیا اور اس کے پہلو میں مسجد تعمیر کی۔

حضرت شاہ لطیف رحمۃ اللہ علیہ جنہیں "بری امام" کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے، ۱۶۱۷ء میں گوجر خان کے نواحی قصبہ سید کسراں میں پیدا ہوئے وہ کمرہ جہاں آپ کی ولادت ہوئی ابھی تک محفوظ ہے اور سید کسراں ہی میں آپ کی والدہ ماجدہ کا مزار بھی ہے۔ یہیں ان کے والد حضرت شاہ محمودؒ کا زمیندارہ تھا۔ انہی کے زیر سایہ ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

کسی خاندانی تنازعہ کے باعث شاہ محمودؒ نے سید کسراں سے ہجرت کر کے شاہراہ کشمیر پر واقع ایک گاؤں "باغ کلاں" میں سکونت اختیار کر لی۔ اسی دیہاتی فضا میں شاہ لطیفؒ پلے بڑھے۔ بچپن میں چند روز ڈھور ڈنگر بھی چرائے۔ مگر دیہات کے رواجی مشاغل سے طبعاً کوئی دلچسپی نہ تھی چنانچہ ان کے فطری رجحان کو دیکھتے ہوئے شاہ محمودؒ نے انہیں غورغشتی کے دینی مدرسہ میں بھیج دیا وہاں سے آپ دوسری درسگاہوں میں بھی گئے اور علوم کی تکمیل کے بعد حج کی سعادت اور سبز گنبد پر حاضری کا شرف حاصل کیا۔

مراجعت کے بعد عبادت اور ریاضت میں بہت زیادہ انہماک رہنے لگا۔ ایک روز گھر سے بغیر اطلاع نکلے اور "باغ کلاں" سے تین میل پرے "کہاہوت" نامی گاؤں کے باہر ایک غار میں جا بیٹھے۔ قریب ہی گھنیرا جنگل تھا جس میں چوروں، سینہ زوروں کا بسیرا تھا۔ وہ کشمیر سے آنے اور جانے والے قافلوں کو لوٹتے پیٹتے اور مار دھاڑ کر کے جنگل میں چھپ جاتے۔ اسی رعایت سے "کہاہوت"

نوچور پور بھی کہا جاتا تھا۔

کئی برس غار کے اندر ذکر و فکر میں نکلے۔ تب ایک مردِ حق آگاہ وہاں آیا —— غالباً شاہ لطیفؒ اپنی جستجو میں اس قدر کھو گئے تھے کہ منزل نے انہیں خود پالیا —— یہ حضرت سخی حیات المیرؒ تھے ان سے حضرت شاہ لطیفؒ نے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی اور عرفان کی تعلیم پا کر اپنا سفر جاری رکھا۔ جب شاہ لطیفؒ کا روحانی کمال اپنی مد پر پہنچا تو شیخ طریقت نے خلافت سے نوازا اور ضلع ہزارہ کے موضع "گکھڑ" جانے کا حکم دیا اور اس مرتبہ حضرتؒ نے کھوڑے سے پنجاڑ کی سمت و و بھیرن کے سامنے نالۂ لنگ میں چلہ کشی کی اور باڑہ میں ایک برگد کے نیچے بیٹھ کر ذکر شغل فرماتے رہے۔ باڑہ میں بزرگ کی بیٹھک اور ایک چھوٹی سی مسجد موجود ہے۔ بعد ازاں آپ وہاں سے کہاں ہوت آ گئے اور اسی "چور پور" کو خلقِ خدا کی ہدایت کا مرکز بنایا۔ روشنی جب پھیلتی ہے اندھیرے خود بخود چھٹ جاتے ہیں۔ سب سے پہلے انہی پشتینی چوروں ڈاکوؤں کو تلقین فرمائی اور راہِ راست پر لے آئے اسی رعایت سے چور پور کا نام "نور پور" ہو گیا۔

خوشبو جب پھیلتی ہے گلشن گلشن مہکاتی ہے۔ علاقہ بھر میں شہرہ ہو گیا۔ لوگ کارواں در کارواں آنے اور فیض پانے لگے۔ ہوتے ہوتے مخبروں نے آگرہ کے پایۂ تخت تک یہ خبر پہنچائی کہ پوٹھوہار کے ایک گوشہ میں روحانیت کی ایسی بزم سجی ہے کہ لوگ پروانہ وار ٹوٹے پڑتے ہیں۔ طلبا، مریدین اور اہلِ حاجات کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صاحبِ خانقاہ کا وجود سلطنت کے لئے خطرہ کا باعث بن جائے ——

شاہجہان نے یہ اطلاع ملتے ہی آپ کو آگرہ طلب کیا۔ مگر اقلیمِ روحانی کے شہنشاہ نے مجازی بادشاہ کے دربار میں جانے سے انکار کر دیا۔

چند ماہ بعد اورنگ زیب عالمگیر سرِ راہ کشمیر پنڈی میں رکا تو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت شاہ لطیفؒ طلبا کو قرآن مجید کی تفسیر کا درس دے رہے تھے۔ وہ خاموش بیٹھا

سنتا رہا۔ آپ کی محبوب اور دل نواز شخصیت علم و فضل اور روحانی کمال کا اس پر گہرا اثر ہوا۔ درس

دورانِ گفتگو اس نے خانقاہ اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے چند نواحی دیہات

کا وثیقہ لکھ کر خدمت میں پیش کیا حضرت مسکرائے اور وثیقہ کی پشت پر یہ شعر لکھ کر واپس

کر دیا ؎

شاہ ما را دِہ دہد منت نہد

رازقِ ما رزق بے منت دہد

اورنگ زیب نے اصرار کیا اگر جاگیر قبولِ خاطر نہیں تو کسی اور خدمت کا حکم فرمایئے۔ جب

بہت مجبور کیا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ خطہ "پوٹھوہار" معاشی اعتبار سے آفت زدہ اور "قبر گوں" علاقہ ہے اگر

کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو زرعی زمینوں کا لگان معاف کر دو۔

اورنگ زیب نے ارشاد کی تعمیل میں پوٹھوہار کو لگان اور مالیہ سے "بری" قرار دینے کا حکم نامہ لکھ

دیا چونکہ یہ رعایت حضرت شاہ لطیفؒ کی خواہش اور ایما پر دی گئی تھی۔ اس لئے لوگوں نے

عقیدت مندی کی راہ سے حضرتؒ کو "بری" کے لقب سے پکارنا شروع کر دیا۔

حضرت بری امام شاہ لطیف رحمۃ اللہ علیہ نے قمری حساب سے نوے برس کی عمر پائی اور

۱۰۰۵ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار بھی اورنگ زیب نے بنوایا تھا۔ اگرچہ اس کا تحریری ثبوت تو کسی

کتاب سے نہیں ملا۔ البتہ مزار کی عمارت اور چار دیواری مغل فنِ تعمیر کی غماز ہے۔

حضرت شاہ لطیفؒ کا عرس مبارک ہر سال بہار کے موسم میں ہوتا ہے جسے میلے کی شکل دے

دی جاتی ہے۔ برسوں یہاں بد مذاق لوگوں نے میلے کے نام پر عیش و نشاط کے ہنگامے بپا رکھے۔ ملک

بھر سے ڈوم ڈھاری اور طائفے ہجوم کرتے۔ بدن کا گداز اور گلے کا لوچ فروخت کرنے والیاں ہجوم

کرتیں حسن و نغمہ کی داد دینے والے لپکتے۔ سازوں کا آہنگ رقص و سرود کا نیرنگ، ڈھولک

کی دھمک، تھپک اور طوائفوں کی بجتی ہوئی آواز اپنا رنگ جماتی اور بلاشبہ لاکھوں روپے حرام

کی راہ میں اٹھ جاتے تا آنکہ ۵۸ء کے مارشل لا، کے حکم سے ان خرافات کا خاتمہ ہو گیا۔

اب پوٹھوہار اور پشاور کے بے شمار عقیدت مند "ڈالیاں" لے کر آتے ہیں۔ مجالس وعظ، قرأت اور قوالیاں ہوتی ہیں اور ماحول پر آفاقی نور برسنے لگتا ہے۔

حضرت سیّد پیر مہر علی شاہ ؒ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے دو برس بعد ۱۸۵۹ء میں حضرت پیر سید مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ہوئی عالی نسب نجیب الطرفین گیلانی سادات میں سے تھے۔ ابجد کے حساب سے آپ کے نام کے ۷۸۶ عدد نکلتے ہیں جو بسم اللہ شریف کے عدد ہیں۔ بائے بسم اللہ ہی کی برکت سے چھوٹی سی عمر میں جب قرآنِ مجید ناظرہ پڑھنا شروع کیا تو ساتھ ساتھ حفظ بھی کرتے گئے۔ ذہانت اور خداداد قابلیت کے جوہر آگے چل کر اور بھی نکھر گئے۔ علوم دینی کی تحصیل برصغیر کی مشہور درس گاہوں میں کی اور مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھ جیسی شخصیتوں سے علم دین حاصل کیا۔

فقہ حدیث تفسیر معقولات منقولات منطق فلسفہ اور طبیعات کی تکمیل کے بعد طریقت میں قدم رکھا اور حضرت شمس الدین سیالوی ؒ سے بیعت ہوئے۔ ذکر و فکر اور عرفان کی منزلیں بڑی تیزی کے ساتھ طے کیں اور شیخ طریقت سے خلافت و اجازت کے بعد وطن واپس آ کر گولڑہ شریف میں علوم شرعیہ کی ایک مثالی درس گاہ قائم کی جس میں طلباء کو خود درس دیتے رہے۔ تصوف کے دقیق مسائل کو اس حسن و خوبی سے حل کرتے کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے۔ درس گاہ کے ساتھ لنگر خانہ بھی جاری کیا جہاں سے طلباء مسافر اور سالکانِ راہ طریقت کو دو وقت کھانا تقسیم ہوتا۔ لنگر قائم کرتے وقت آپ نے اپنے متوسلین سے فرما دیا کہ یہ لنگر مہمانوں کا ہے۔ اس پر میرا یا میری اولاد کا کچھ عمل دخل نہیں۔ آپ کے اس ارشاد پر سختی سے عمل ہوتا آیا ہے۔ ایک روز آپ کے صاحبزادے حضرت سید غلام محی الدین المعروف بابو صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شہر آنا تھا لنگر کے نگران قطب خان سے کھانا مانگا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لنگر کھلنے سے پہلے کسی کو کھانا تقسیم نہیں ہوگا۔

گولڑہ شریف مارگلہ کے دامن میں اٹک اور جہلم کے درمیان ہے اور اس کو حضرت ؒ نے ایک ایسے دور میں تبلیغ کا مرکز بنایا جب بیسویں صدی کے آغاز میں جدید مغربی تہذیب کے علاوہ مختلف

لادینی فتنے سر اُٹھا رہے تھے۔ خطۂ پوٹھوہار جو زمانۂ قدیم سے شمشیر گیروں کا وطن رہا ہے۔ ان دنوں سخت معاشی بحران سے دوچار تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی اقتدار سے کوئی پون صدی پہلے سکھا شاہی کے دورِ استبداد میں ظلم و ستم کا جو دروازہ کھلا تھا اس نے اہلِ پوٹھوہار کو عبرت ناک معاشی مشکلات میں مبتلا کر دیا تھا۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے پورے پنجاب کو اپنی قلمرو میں شامل کیا تو اس قہر گوں علاقے کی جغرافیائی حیثیت اور عسکری روایات کے پیشِ نظر اہلِ پوٹھوہار کو تعلیم میں پس ماندہ رکھنے کی دانستہ کوشش کی۔ زرعی اعتبار سے یہ خطہ بارانی ہے۔ لبسا اوقات محنت و مشقت کے باوصف کاشتکار اپنا پیٹ پال نہیں سکتے اور ادنیٰ فوجی ملازمتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اس زمانے میں حالات اتنے دگرگوں تھے کہ عام بھرتی کھلتے ہی لوگ بھاری تعداد میں اپنے دیہات سے نکلے اور فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ بصیغۂ ملازمت انہیں دور افتادہ چھاؤنیوں میں رہنے کا موقع ہوا۔ اس طرح ان کا اپنا ماحول، تمدنی، مذہبی روایات اور اخلاقی فضا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور یہی وہ مرحلہ ہے جب ان کو اسلام کے مرکز سے وابستہ رکھنے کی ایسی ضرورت ہوئی جو اس سے پہلے کبھی پیش نہ آئی تھی ـــــ یہ عظیم مقصد خانقاہِ عالیہ گولڑہ شریف نے پورا کیا۔

آغاز میں حضرت پیر صاحبؒ نے علاقہ بھر کا تبلیغی دورہ کیا۔ بیان میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ دلوں میں نورِ ایمان پیدا ہوتا۔ تقریر ایسی عام فہم کہ ہر استعداد کا آدمی متاثر ہوتا۔ حسنِ بیان وصفِ خاص تھا اور اس خداداد جوہر سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا کام یہ لیا کہ مسلمانوں کے درمیان جو اجتہادی اختلافات باعثِ نزاع تھے وہ ختم ہونے لگے۔ بحث و جدل اور مناظروں کی گرم بازاری ماند پڑنے لگی ـــــ ملتِ اسلامیہ کا کسی ایک نکتہ پر متفق ہو جانا بھی پیر صاحبؒ کا سب سے بڑا روحانی کمال ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں فرنگی نے اپنے مفاد کی خاطر تفرقہ

کی جس آگ کو ہوا دینی شروع کی تھی اس کا زور ٹوٹ گیا۔ اس بارے میں حضرت نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو آج بھی دستیاب ہیں اور ذوق وشوق کے ساتھ مطالعہ کی جاتی ہیں۔

علمائے کرام نے اعتراف کیا ہے کہ حضرت سیدمہر علی شاہؒ کا وجود اپنے دور کے علماء میں اس رنگ سے جلوہ گر تھا جس طرح ستاروں کے جھرمٹ میں ماہتاب ہوتا ہے۔ ملک بھر میں جہاں جہاں بھی آپ کی آواز پہنچی توحید و رسالت کے صحیح مسلک کو پھیلانے کی کوشش فرمائی۔

یہی نہیں بلکہ فرنگی نے سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی جو سازش بھی کی خواہ وہ تہذیبِ نو کی لعنت تھی یا کسی جعلی نبوت کی صورت میں نمودار ہوئی، حضرت نے اس کے خلاف ایسا بھرپور جہاد کیا کہ باید و شاید۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے دوران علاقہ کے دوسرے گدی نشینوں نے اپنے مریدوں کو برطانوی فوج میں بھرتی کی اجازت دے دی تھی مگر حضرت پیر سید مہر علی شاہؒ نے جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرنگی استعمار سے تعاون نہیں کیا۔

ایک مرتبہ انگریز ڈپٹی کمشنر نے حضرتؒ کو ملاقات کے لئے بلایا تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "فقیر کا بادشاہوں کے دروازہ پر کیا کام ہے۔" اس موقع پر قاضی سراج دین بار ایٹ لاء نے عرض کیا کہ ملاقات میں کیا مضائقہ ہے۔ حضرت نے فرمایا ـــــ

"میں مغرور تے متکبر ناں۔ میں جس ویلے ارادہ کرناں میںنڈا
دل بند ہو ویندان اے تے ہُن میں خصماں اگے وی عرض کر چھوڑساں"

چنانچہ اس فریاد کا ایک شعر ہے ؎

ترے مڈھ قدیم دے گولیاں نوں
خوف دیندے نی چپراسیاں دا

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ڈپٹی کمشنر خود گولڑا شریف حاضر ہو گیا۔ گولڑہ تھانہ میں آکر بیٹھا اور ملاقات

کے لئے بلایا۔ آپ کے ایک خلیفہ محبوب عالم صاحب نے عرض کیا۔ اب صاحب بہادر سے مل لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ حضرت نے فرمایا —

"توں اپنا ایمان مینڈے ایمان وِچ ناں واڑ۔"

کچھ دیر میں ڈپٹی کمشنر اور اس کی میم آپ کی خدمت میں آگئے۔ اس روز سخت گرمی تھی اور کئی ہفتوں سے بارش بھی نہ ہوئی تھی۔ خلق خدا اُف! اُف! کر رہی تھی۔ صاحب بہادر نے کہا "پیر صاحب بارش کے لئے دعا کریں۔"

حضرت ؒ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اللہ مینڈے مشورے ناں محتاج نئیں، تساں وی دعا کردے ہیں وی دعا کرساں"۔ تھوڑی دیر میں کالی گھٹا گھر کے آئی اور رحمتوں کا جھالا برس گیا۔

حضرت پیر صاحب ہر حیثیت کے آدمی سے اس کی عقل کے مطابق گفتگو فرمایا کرتے۔ ایک خاتون نے عرض کیا کہ اس کا شوہر پردیس گیا ہوا ہے اور وہ ہر وقت روتی رہتی ہے۔ دعا کریں کہ وہ آجائے۔ حضرت ؒ نے فرمایا —

"کیا ہوسی جے ساون بھادروں وِچ گاواں مجھیاں
گھار چرن ویندیاں نیں۔ فیر ترپل چینی اے تے
اُس گھار وِچوں نویں شگوفے پھٹنے نیں۔
ایسے طرح رونا تے بوّوں چنگی شے وے۔ اوس
نال دل وِچ شگوفے پھٹنے نیں ———"

حضرت ؒ کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کامل و اکمل تھے۔ عرفان کی بلندیوں تک پرواز تھی۔ فرماتے ہیں ـــ

کُٹھ نیکون تاں کل دی گل اے اساں اگے پریت لگائی
توں میں حرف نشان نہ آہا جدوں دتی میم گواہی

حضرتؒ کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مشاہدہ کی نعمت سے آپؒ مالا مال ہو چکے تھے۔
آپ کی لافانی نعت کا آخری شعر ہے ؎

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھیں کتھے جا اڑیاں !

حضرت حافظ محمد عبداللہ دیوان حضوریؒ

پوٹھوہار کے موضع بشندور میں سلسلہ عالیہ قادریہ کا ایک آستانہ مرجع خلائق ہے آج سے ۳۲۵ برس پہلے تخت پڑی ہیں ۔ ۲۵ شعبان ۴ ، ۹ ہجری کو حضرت دیوان حافظ محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ہوئی۔ آپ کا سلسلہ نسب شہید کربلا سقائے اہل بیتؓ حضرت عباس علمدارؓ سے جا ملتا ہے۔

آپ مادر زاد ولی تھے۔ بچپن ہی میں کرامتوں کا ظہور ہونے لگا تھا۔ حفظِ قرآن مجید کے بعد علوم متداولہ میں کمال حاصل کیا۔ اور پھر بغداد تشریف لے گئے۔ وہاں برسوں ذکر و فکر میں مصروف رہے۔ قیام بغداد ہی کے دوران ۱۲ مرتبہ حج کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ ایک رات حضور غوث الاعظم قدس سرہٗ العزیز کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مراجعت کا حکم ہوا اور چند تبرکات ساتھ لے جانے کی بھی اجازت ملی۔ ان تبرکات میں ایک پرانا عصا، عمامہ مبارک لکڑی کا بادیہ اور چمچہ ہے۔ لوگ ان تبرکات کی زیارت کے لئے حاضر ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت دیوان صاحب علیہ الرحمۃ کی شانِ مرتبت کے باعث حضرت پیر سید مہر علی شاہؒ صاحب گولڑوی بشندور کو بغدادِ صغیر کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ معمول تھا جب کبھی سفر کے ہنگام ادھر سے گذر ہو جاتا۔ ریل گاڑی میں بھی تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور فرماتے یہاں غوث الاعظم قدس سرہٗ کا ایک محبوب آسودہ ہے۔

بغداد سے واپسی پر حضرت دیوان حضوریؒ دہلی ٹھہرے اور حضرت شاہ محمد بندگیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ خلافت و اجازت حاصل کرنے کے بعد بشندور تشریف لائے اور خلق خدا کی اصلاح کا فریضہ انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔

۲۰ رشوال ۲ ، ۱۰ ہجری کو وصال ہوا۔

اورنگ زیب کے بھائی داراشکوہ نے مزار شریف اور اس کے ملحق درس گاہ اور مہمان خانہ تعمیر کرایا۔

ماضی قریب میں یہاں کے سجادہ حضرت اکبر شاہ صاحبؒ بہت بڑے درویش گذرے ہیں۔

حضرت معظم دریاؒ

بڑے صاحب تصرف بزرگ گذرے ہیں، یہ بھی سیّد کسراں کے رہنے والے تھے حضرت باوا فضل الدین کلیامیؒ کے ہم عصر تھے۔ ایک مرتبہ باوا صاحبؒ ان سے ملنے گئے۔ حضرت معظم دریاؒ نے ان کے لئے مرغ اور پراٹھے پکوائے کھانا سامنے آیا تو باوا فضل الدین صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں نے ساری عمر نفس سے جہاد کیا ہے لیکن اب بھی نفس مجھ پر غلبہ کرلیتا ہے اور کبھی میں اسے مغلوب کرلیتا ہوں اس لئے یہ مرغن کھانا میں نہیں کھاتا۔ حضرت معظم دریاؒ نے اصرار نہیں کیا خود کھانا شروع کردیا اور فرمایا کہ ہم تو دھند لکے میں آئے تھے اور یہیں دھند لکے ہی میں روپوش ہو جانا ہے اس لئے ہم نفس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے ـــــ یہ ان دونوں بزرگوں کی ذاتی کیفیات اور طبعی خصوصیات ہیں ویسے اس سے کوئی شرعی رُخ استنباط نہیں کیا جاسکتا۔

کہتے ہیں حضرت معظم دریاؒ کی اہلیہ آشوب چشم میں مبتلا ہو کر علاقہ ہی کے ایک بزرگ کے مزار پر دعا کے لئے گئی تھیں۔ واپس آئیں تو حضرتؒ نے پوچھا کہاں گئی تھیں، انہوں نے بتایا کہ فلاں سید بادشاہ کے مزار پر گئی تھی کیونکہ آنکھیں آئی ہوئی ہیں۔ حضرت نے غضبناک ہو کر فرمایا آنکھیں "آئی نہیں" "گئی ہوں گی"۔ اتنا فرمانا تھا کہ اہلیہ کی آنکھ کا ڈھیلا اُبل کر باہر جا پڑا۔ رشتہ داروں نے پاؤں پکڑلئے اور کہا کہ دوسری آنکھ نکل گئی تو اندھی ہو جائے گی، اتنا غضب نہ فرمائیے خیر دوسری آنکھ محفوظ رہی۔ اس سے حضرت معظم دریاؒ کی جلال آفریں طبیعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

دَودَہ شاہ حقّانی رح

موضع دانگلی میں ان کا مزار ہے۔ جسے عوام "دَودَہ شاہ قانی بادشاہ" کے دربار سے یاد کرتے ہیں۔ "بادشاہ" کا لاحقہ اس مردِ درویش کے نام کے ساتھ یونہی نہیں لگا بلکہ اس کا پس منظر یہ ہے کہ گکھڑ حکمران مراد قلی خان کا ایک بیٹا اللہ قلی خان تھا۔ جو بڑا جیالا اور پاکباز نوجوان تھا۔ پوٹھوہار کی مشہور رانی منگلا کے ساتھ اس کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ اللہ قلی خان ۱۶۷۶ء میں حاکم بنا مگر چند سالوں کے بعد اس کا دل سلطنت سے اچاٹ ہوگیا۔ اس کی فوری وجہ یہ ہوئی کہ جودھرہ قبیلے کے ساتھ ایک خونریز جھڑپ میں بہت سی جانوں کا نقصان ہوا جس کا اللہ قلی خان کے قلب پر گہرا اثر ہوا اور اس نے کاروبارِ سلطنت اپنی بیوی رانی منگلا کے سپرد کر کے درویشی اختیار کر لی شاہی قلعہ کے متصل ایک ٹیلے پر کھلے آسمان تلے جا بیٹھا۔ اور وہیں عمر بھر اللہ سے لو لگائے بیٹھا رہا قلعہ سے شاہی نوبت کی آواز صبح و شام فضا میں ابھرتی۔ اللہ قلی خان کہتا یہ نوبت چند روزہ ہے مگر میری نوبت قیامت تک یہاں گونجتی رہے گی۔

اللہ قلی خان کی بیٹی، اورنگ زیب عالمگیر کے چوتھے بیٹے اکبر شاہ ثانی کے ساتھ بیاہی گئی۔ اس قرابت داری اور محبت کی راہ سے عالمگیر انہیں "دَودَہ مردِ حقانی" کہا کرتے۔ "دودہ" فارسی زبان میں خویش اور رشتہ دار کو کہتے ہیں۔ گویا اللہ قلی خان کا عرفی نام جو اب تک مشہور ہے عالمگیر کا دیا ہوا ہے۔ رانی منگلا کے انتقال پر اللہ قلی خان کا بیٹا مسمی سلطان دولو دلاور خان ۱۷۰۵ء میں پوٹھوہار کا حاکم بنا۔

حضرت حقانیؒ کے مزار کے نیچے دریائے جہلم بہتا ہے جو پیچھے سے زور شور کے ساتھ آتا ہے مگر مزار کے قریب پہنچ کر اس کی روانی کا شور انتہائی خاموشی میں بدل جاتا ہے اور تین میل کے رقبہ میں خاموش بہتا چلا جاتا ہے۔ مزار کی چاردیواری میں حضرت حقانیؒ کے علاوہ ان کے بعد آنے

والے سجادہ نشینوں کے چودہ مزار ہیں۔ یہ روایت مشہور ہے کہ چار دیواری میں تنکا رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ مگر رحلت کرنے والے ہر سجادہ کے لئے لحد کی جگہ نکل آتی ہے۔

حضرت سائیں غلام شاہؒ

باغ بوٹا میں حضرت سائیں غلام شاہؒ کے عرس پر ربیع الاول کے دنوں میں ہر سال ایک میلہ لگتا ہے۔ اس مزار پر علاقہ بھر سے باؤلے کتے کے کاٹے لوگ آتے ہیں اور لحد پر رکھے ہوئے برتنوں کا پانی پینے سے شفایاب ہو جاتے ہیں۔

حضرت سیّد محمد شاہ صاحبؒ

خانوادہ بخاری سادات کے چشم و چراغ میرپور آزاد کشمیر کے ایک نواحی دیہات کنہیارا میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد حضرت سید نور شاہ بھی کامل درویش تھے۔ انہی کے زیر سایہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کی۔ بچپن ہی سے فقر کی طرف مائل تھے۔ جوانی میں استغراق بہت بڑھ گیا تھا۔ اسی عالم میں قلبی واردات کو پنجابی شعروں میں ڈھالنا شروع کیا۔ اہلِ عرفان ان کے اشعار کو توحید کی جان سمجھتے ہیں۔ پوٹھوہار کی شاذ ہی کوئی محفل تقریب عرس یا میلہ ہوگا۔ جہاں سیّد محمد شاہ کے اشعار نہ سُنے سنائے جاتے ہوں۔ بیر محمد شاہ انہی کی تصنیف ہے۔

آپ کا وصال ۱۸۸۴ء میں ہوا۔ عرس کنہیارا شریف میں مدتوں دھوم دھام سے منایا جاتا رہا مگر جب مزار اقدس منگلا بند کی حدود میں آ گیا تو آپ کے تابوت کو مرقد سے نکال کر موضع بوُچیا ر مندرہ ضلع راولپنڈی) لایا گیا اور ۱۹ جون ۱۹۶۷ء کو مجمعِ کثیر کی موجودگی میں تدفین عمل میں آئی۔ ملک کے مشہور شاعر جناب میجر سیّد ضمیر جعفری انہی کے نواسے ہیں۔

حضرت سید حیدر علی شاہ جلال پوری

جہلم کے پار موضع جلال پور کیکناں میں حضرت سید حیدر علی شاہ صاحبؒ کا مزار ہے آپ بھی سلسلہ عالیہ چشتیہ میں حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ سے بیعت ہوئے۔ دو ماہ بعد ہی آپ کو خلافت و اجازت مل گئی۔ جلال پور میں سلسلۂ رشد و ہدایت جاری فرمایا۔ بلاشبہ ہزاروں بندگانِ خدا نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی سعادت پائی۔

۶ جمادی الثانی ۱۳۲۶ ہجری کو وصال ہوا۔ حکیم امت علامہ اقبالؒ نے قطعہ تاریخِ وصال لکھا۔

ہر کہ بر خاکِ مزار پیر حیدر شاہؒ رفت
تربتِ او را امینِ جلوہ ہائے طور گفت
ہاتف از گردوں رسید و خاکِ او را بوسہ داد
گفتمش سالِ وفاتِ اُو بگو "مغفور" گفت

۱۳۲۶ھ

حضرت باوا بودے شاہؒ

حضرت باوا بودے شاہؒ اور ان کے بیٹے جناب حیدر شاہؒ صاحب بھی خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ سید کسراں کے رہنے والے اور حضرت بری شاہ لطیفؒ کے خاندان سے تھے۔ ان کا انتقال رُبع صدی پہلے ہوا۔ ان کا معمول تھا کہ ہر روز لنگر خود تقسیم فرماتے۔ ایک ہانڈی میں دال گوشت ہوتا اور ایک ٹوکری میں چند روٹیاں رکھ لیتے اور دونوں کو کپڑے سے ڈھانپ دیا کرتے۔ جو آتا اسے ہانڈی میں سے دال شوربا کا بڑا چمچہ بھر کر دیتے اور کپڑے کے اندر ہاتھ بڑھا کر ٹوکری سے روٹیاں بھی نکال کر دیتے دن بھر یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ عجیب کرامت اور تصرف تھا۔ ہندو سکھ انکے بہت عقیدتمند تھے

حضرت باوا افضل الدین کلیامیؒ

پنڈی سے سولہ میل دور، موضع کلیام اعوان میں حضرت باوا افضل الدین چشتی صابری علیہ الرحمۃ کا مزار ہے۔ بڑے پایہ کے درویش تھے۔ مجاہدات شاقہ میں زندگی بسر کی۔ فرمایا کرتے درویشی جہاد بالنفس کا نام ہے۔ لذاتِ دنیاوی سے عمر بھر کنارہ کش رہے۔ گرمیوں میں تیز دھوپ کے اندر ایک سِل پہ پڑے رہتے اور سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں میں ٹھنڈے پانی کی دھار سر پر ڈلواتے اور فرماتے "ہائے سڑ گیاں، ہائے بل گیاں" — یہ عشق کی آگ تھی جس میں آخری سانس تک جلتے رہے۔

۱۸۹۲ء میں وصال ہوا۔ جنازہ کی نماز حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ نے پڑھائی۔ اب ہر سال جنوری میں وہاں بہت بڑا عرس ہوتا ہے جو دس روز برابر جاری رہتا ہے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ مزار پہ عرس کے دنوں میں قوالی ہو رہی تھی کہ لحد کو جنبش ہونے لگی۔ حاضرین نے یہ منظر اپنی آنکھوں دیکھا۔

حضرت گولڑوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں — جس قسم کی ریاضاتِ شاقہ نفسانی راحت کو توڑنے والی انہوں نے کی ہیں۔ اہلِ زمانہ نے ان کی نظیر نہیں دیکھی۔ اہلِ حاضران کے اندرونی ورد اور شغلِ باطن سے بے خبری کے باعث ان پر معترض ہوتے تھے۔ ان کا کوئی نفس اسمِ ذات کے ذکر سے خالی نہ گزرتا اور کمال استغراقِ حال سے اشغالِ ظاہری کی طرف توجہ کرنے سے معذور تھے۔

حضرت شاہ صفیرؒ

موضع شاہ صفیر میانہ موہڑہ سوہاوہ تحصیل جہلم میں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ مشہور ہے کہ مزار پر حاضری دینے سے جذامی کو صحت ہو جاتی ہے۔

یونانی حملہ آوروں کی زد میں

۳۳۴ قبل مسیح ـــــ سکندر اعظم کی بے پناہ قوت کے سامنے ایران کا شہنشاہ دارا ثالث جان بچانے کی فکر میں مارا مارا پھر رہا تھا۔

۳۲۹ قبل مسیح کے موسم سرما میں سکندرِ اعظم کابل پہنچا اور اسی سال موسم بہار تک برف پگھلنے کے انتظار میں اسے وہاں رکنا پڑا۔ کہ ہندوکش کا راستہ کھلنے پر وہ آگے روانہ ہو۔

۳۲۷ ق م میں سکندر اعظم نے ہندوکش کو عبور کر لیا اور تقریباً ایک سال شمال مغربی ریاستوں کو زیر کرنے میں صرف کیا کیونکہ یہ ایرانی دور کی متمول ترین باجگذار ریاستیں تھیں جہاں سے ایرانی فوج کو سامانِ خور و نوش اور خزانے کو سیم و زر مہیا ہوتا۔

یوں تو ۳۲۶ ق م میں سکندر اعظم نے دریائے سندھ کو عبور کیا مگر ٹیکسلا کے حکمران راجہ امبھی کے لئے اس سے بہت پہلے لمحہ فکر پیدا ہو گیا تھا کہ کابل کو سر کرنے کے بعد یونانیوں کا اگلا قدم اسی کی راجدھانی پر ہوگا۔ چنانچہ اسے اپنا راج پاٹ بچانے کی تشویش لاحق تھی۔ اسے سکندرِ اعظم کے مقابل کوئی متحدہ محاذ کھولنے کا خیال نہیں آیا۔ ویسے بھی برصغیر کی فضا ایسے اتحاد کے لئے ان دنوں سازگار نہ تھی۔

امبھی کی حکومت دریائے اٹک سے ٹیکسلا کے آس پاس تک تھی اور پنڈی سے جہلم کے رقبہ میں چند جنگجو سردار حکمران تھے۔

جہلم کے پار گجرات اور شاہ پور کے علاقے پورس کی قلمرو میں تھے۔ امبھی اور پورس کی الگ الگ

ریاستوں کا وجود اور آپس کی آویزش سے پتہ چلتا ہے کہ پوٹھوہار کا علاقہ بہت پہلے ایرانی تسلط سے نکل چکا ہوگا تاہم اتنا مسلم ہے کہ ۵۱۸ قبل مسیح میں دارا اول نے ٹیکسلا اور اس کے نواحی علاقے فتح کرکے ایرانی سلطنت میں شامل کئے تھے۔

پورس کا وجود بھی امبھی کے لئے وجہ خوف تھا۔ پورس لیم شحیم مضبوط ہاڑ کا جنگجو اور دلیر راجہ تھا اور ایک عظیم سلطنت کا منصوبہ اس کے زیر غور تھا جس کا وہ اہل بھی تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے وہ اپنی مملکت کے مشرق کی جانب دریائے راوی کے پار تک یلغار کرچکا تھا۔ اس پیش قدمی میں اسے پونچھ کے راجاؤں کی حمایت اور عملی امداد بھی حاصل رہی۔ اگرچہ وقتی طور پر وہ ناکام رہا تاہم مناسب موقع کی تاک میں تھا اور امبھی اس کی نظر میں حیثیت زبوں سے بیش نہیں تھا۔ ادھر صورت حال یہ بھی تھی کہ ٹیکسلا کے نواحی پہاڑی علاقہ کے حکمران ابھی تسار سے بھی امبھی کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔

چنانچہ ۳۲۷ ق م میں گرمی کا موسم شروع ہوچکا تھا جب سکندر اعظم نے اپنے دو سفیر ٹیکسلا بھیج کر راجہ امبھی کو کابل بلوا کر ضروری معاملات طے کرلئے۔ یونانی فوج کا ایک ڈویژن بھی مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے امبھی کے ہمراہ آیا۔ سکندر خود اس وقت کابل کی شمالی وادی میں اکا دکا جھڑپوں سے نمٹ رہا تھا۔

۳۲۶ ق م کے آغاز میں سکندر اعظم ایک لاکھ بیس ہزار پیادہ اور پندرہ ہزار سواروں پر مشتمل لشکر لے کر باجوڑ کے راستے سوات ہوتا ہوا صوابی کے قریب دریائے اٹک کے کنارے خیمہ زن ہوا۔

دریائے اٹک کے دائیں کنارے گھنا جنگل تھا جس میں شیر دھاڑتے اور ہاتھی چنگھاڑتے یہاں سے سکندر نے ہاتھی پکڑوائے۔ انہیں آہنی زنجیروں میں جکڑ کر سدھایا اور اپنی فوج میں شامل کرلیا کیونکہ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ جہلم کے اس پار راجہ پورس ہاتھیوں کا بریگیڈ لئے

کھڑا ہے۔

یونانی لشکر نے تربیلا سے کچھ اوپر دریا کو عبور کرنے کی خاطر اسی جنگل سے وافر لکڑی حاصل کر کے کشتیاں بنوائیں۔ وہ مقام جہاں سکندر نے کیمپ لگایا اٹک گاؤں سے سولہ میل اوپر اوہند تھا۔ یہاں یونانی دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دی گئیں۔ شہسواری کے مظاہرے ہوئے۔ سکندر اعظم کو احساس تھا کہ وہ ایک جہانِ نو کی چوکھٹ پر کھڑا ہے اور اس کے لئے فتوحات کا نیا افق کھل رہا ہے۔

۳۲۶ ق م کے موسم بہار کی ایک سہانی صبح یونانی فوج نے دریا کو عبور کرنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ غروبِ آفتاب تک برابر جاری رہا۔ دریا کے پار راجہ امبھی کے سواروں کا ایک دستہ پذیرائی کے لئے موجود تھا جس کے ساتھ تیس ہاتھی اور مہمانوں کی ضیافت کے لئے بے شمار بھیڑ بکریاں اور بیل بھی تھے۔

دو تین روز بعد سکندر ٹیکسلا پہنچا۔ امبھی نے خود شہر سے باہر آ کر اسے خوش آمدید کہا اور بھیر پہاڑی کی طرف لے گیا۔ شہر کے دروازے یونانی سپاہیوں کے لئے کھول دیئے گئے۔ مقامیوں کے دو رویہ کھڑے ہجوم نے تحیر کے ساتھ اجنبی لشکر کو اپنے کوچہ و برزن میں داخل ہوتے دیکھا۔

دم لے کے چلنے کی خاطر سکندر اعظم کو بہت دنوں ٹیکسلا میں رکنا پڑا اور اس دوران امبھی کی مہمان نوازیوں کا خوب لطف اٹھایا۔ یونانیوں نے اس شہر کو بغور چھان پھٹک کر دیکھا مضافات کی سیر کی انہوں نے شہر سے کوئی دس میل دور چند سادھوؤں کو دیکھا جو ننگ دھڑنگ اپنے گیان دھیان میں مصروف تھے۔ لوگ ان کے حضور کورنش اور بندگی بجا لاتے اور انہیں انتہائی واجب الاحترام خیال کرتے۔ سکندر اعظم تک بھی ان کا احوال پہنچا تو اسے ان سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ مگر خود ان کے پاس چل کر جانا شایانِ شان نہ تھا اس لئے اپنے ایک

قاصد ایسی کرٹس کو بھیجا۔

کرٹس لکھتا ہے "شہر سے دس میل دور یہ پندرہ نفوس بالکل برہنہ بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ دھوپ کی تمازت سے زمین اتنی تپ رہی تھی کہ ننگے پاؤں چلنا دوبھر تھا۔ ترجمان کی وساطت سے گفتگو ہوئی اور کرٹس نے انہیں بتایا کہ یونانی فاتح سکندر اعظم ان کے مسلک کے بارے میں معلومات کرنا چاہتا ہے ان میں سے ایک سادھو نے ترش روئی کے ساتھ جواب دیا۔ کہ مغربی لباس اور بوٹ سوٹ پہننے والا یونانی جب تک برہنگی اختیار کر کے تپتے پتھر پر آ کر نہ بیٹھے ہماری بات سمجھ نہیں سکتا۔ دوسرے سادھو نے ذرا نرمی کے ساتھ کہا کہ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ سکندر جیسا فاتح ہمارے علم و فراست کی گہرائی کو جاننے کی خواہش رکھتا ہے لیکن وہ ہماری زبان سے نابلد ہے اور ترجمان کی وساطت سے ہماری تعلیمات کو سیکھنے کی کوشش ایسی ہے جیسے چشمے کے نتھرے پانی کو کیچڑ میں بہا دیا جائے کیونکہ عامی تک صرف الفاظ ہی پہنچ پاتے ہیں' الفاظ کے معانی کی روح تک رسائی ممکن نہیں۔

پھر انہوں نے کرٹس سے یونانیوں کے طریقِ عبادت اور تپسیہ کے بارے میں سوالات کئے اور اثبات میں جواب پا کر بہت ہی خوش ہوئے لیکن اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ جہاں تک نروان کا تعلق ہے یونانی دانشوروں کے لئے لباس کا اہتمام اور کپڑوں کا بے تحاشہ استعمال ہی حجاب بنا ہوا ہے۔"

راجہ امبھی کے اصرار پر ایک سادھو کو کپڑے پہنا کر سکندر کی خدمت میں لے جایا گیا۔ اس حرکت پر دوسرے سادھوؤں کو ناگواری ہوئی اور اس کو انہوں نے برا بھلا کہا۔

سکندر کی اس سادھو سے جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل کسی کتاب میں درج نہیں۔ البتہ ایک اور یونانی آرسٹبلس ARISTOBULOUS اسی گروہ کے دو مہاتما سادھوؤں کے بارے میں لکھتا ہے "ایک کے سر پر لانبے بال اور دوسرے کا سر گھٹا ہوا تھا۔ ان دونوں کے چیلے

جانتے بھی تھے۔ جب کبھی یہ مہاتما منڈی اور بازار میں آتے لوگ ان کے درشن کرنے کو جمع ہو جاتے وہ جس فروخت جنس کو چاہتے بلا تکلف اٹھا لیتے۔ لوگ عقیدت کی راہ سے ان کے سروں پر روغن کنجد بچھاور کرتے جو ان کی آنکھوں تک بہہ نکلتا۔ کھانے کے لئے تل اور شہد ملا کر پیش خدمت کرتے۔ جس وقت بڑا مہاتما کسی جگہ تیز دھوپ میں دراز ہو جاتا' دوسرا ایک ٹانگ پہ دن بھر اس کے سرہانے کھڑا رہتا ــــــ"

ٹیکسلا میں سکندر اعظم نے ایک دربار عام بھی لگایا جس میں راجہ امبھی کے علاوہ دوسرے مقامی سرداروں نے تحفے تحائف اور نذریں پیش کیں۔ سکندر نے بھی نوازش خسروانہ سے کام لے کر انعامات تقسیم کئے اور ان کے حدیقے اور جاگیروں میں توسیع کے فرمان جاری کئے۔ بالخصوص راجہ امبھی کو بہت سا قیمتی ساز و سامان اور سونے چاندی کے برتن عطا کئے۔ یونانی افسروں کو سکندر کی یہ داد و دہش ایک آنکھ نہ بھائی اور ناقدانہ گفتار کا بازار گرم ہو گیا ــــــ مگر صورت حال یہ تھی کہ سکندر اپنے تیئں نسلی امتیازات سے بالاتر ایک شہنشاہ عالم تصور کرنے لگا تھا جس کے سائے میں نسل انسانی کی سطح برابر ہو گئی تھی۔

سکندر ٹیکسلا میں اپنی دربار داری سے ابھی فارغ نہ ہوا تھا کہ پورس کا قاصد پیغام لے کر آیا کہ مجھ سے بزدلانہ اطاعت کی توقع نہ رکھنا میں تم سے جنگ آزمائی کا حوصلہ رکھتا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پورس کو درپیش خطرات کا پورا احساس تھا اسے سکندر اور امبھی کے مابین طے پانے والے معاہدہ کا بھی علم تھا مگر خوف اور ہراس نے اس کے حواس کو بے قابو نہیں کر دیا تھا۔ وہ میدان جنگ میں تیر اور شمشیر کے ساتھ اپنی تقدیر کے فیصلہ کا بھرپور عزم رکھتا تھا۔ وہ اس خطہ میں اپنے عہد کے سارے راجاؤں سے زیادہ جنگ آزما سورما تھا اور اپنی عزت نفس کے تحفظ کی خاطر سینہ سپر ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ یونانی حملہ آوروں اور اس کے مقامی حلیفوں کے ساتھ فیصلہ کن جنگ نہ کر سکا تو اس کا

وسیع تر مملکت بنانے کا خواب ادھورا رہ جائے گا۔

مگر سکندر کی آمد نے اس کے عزائم پارہ پارہ کر دیئے۔ امبھی کی بزدلانہ اطاعت کا اقدام یونانی فاتح کے لئے ہندوستان میں داخلہ کا دروازہ کھول کر سرِ تسلیم خم کر دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ پورس نے اپنی مختصر مملکت کے محدود وسائل سے سامانِ حرب وضرب جمع کیا اور جہلم کے آس پاس واقع پہاڑیوں کے تنگ دروں میں مورچہ بندی شروع کر دی۔ اس کے پاس تیس ہزار پیادہ فوج۔ چار ہزار گھوڑے تین سو جنگی رتھ اور دو سو ہاتھی تھے۔

ٹیکسلا میں یونانی سپاہی ملیریا اور ہیضہ کا شکار ہو گئے اور انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ فوج کے معالج مرد وتانی نے بیماریوں کا تن دہی سے علاج کیا۔ جب وبا کا زور کچھ کم ہوا تو سکندر اعظم نے روٹھے ہوئے فوجیوں کو اپنے باپ کا واسطہ دے کر آگے بڑھنے پر آمادہ کر لیا۔

بات صرف اتنی نہیں تھی کہ فوج کو ملیریا نے آ لیا تھا بلکہ پروگرام کے مطابق جب یونانی لشکر نے ایران کی سلطنت کو زیر کر لیا اور ان کے تمام علاقے (بشمول ٹیکسلا) قبضا لئے تو اب مزید فتوحات کے لئے مارا مارا پھرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تھی۔

سکندر نے ٹیکسلا سے اپنی ایک ڈویژن فوج مع ساز و سامانِ جنگ اور کشتیاں جہلم کی سمت روانہ کر دیں اور خود سرِ راہ جہلم مارگلہ کی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ مارچ کرتا ہوا نکلا۔ ولڈیورنٹ کی تحقیق کے مطابق موجودہ راولپنڈی کے قریب اس کو مقامی سرداروں کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور لڑتا بھڑتا انہیں زیر کرتا ہوا آگے بڑھا۔ دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر پنڈ دادن خان کی جانب کیمپ لگانے کا حکم دیا۔ جو کیمپ کئی میل رقبہ کو محیط تھا۔

بائیں کنارے سے پورس کے دیکھ بھال کرنے والے دستوں نے یونانیوں کے خیمے ایستادہ

دیکھے۔ انہوں نے شاہی محافظ دستوں کے زرق برق لباسوں کی سج دھج بھی دیکھی اور سکندر اعظم کو بھی اپنے افسروں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھا۔ اسی ہجوم میں ٹیکسلا کے راجہ امبھی کے پانچ ہزار مسلح سپاہی بھی تھے جو یونانی حملہ آوروں کی کمان میں پورس کے خلاف لڑنے آئے تھے۔

پورس اور سکندر کی افواج کے درمیان صرف دریائے جہلم کی وسعت حائل تھی اور دریا ان دنوں چڑھاؤ پر تھا۔

سکندر اعظم نے دریا کے مغربی رخ دارا پور کے موڑ پر جو نشیب میں واقع ہے دریا کو عبور کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ دریا کا پاٹ وہاں کم ہے۔ سکندر کو اوٹ کی بھی ضرورت تھی کیونکہ جہلم سے چار میل اوپر پہاڑی علاقہ ختم ہو جاتا ہے۔

دریائے جہلم کو پار کرنے کے پانچ پتن ہیں (پتن اس مستقل مقام کو کہتے ہیں جہاں سے دریا کو عبور کیا جاتا ہے)

۱. کھڑی چیچیاں۔

۲. دارا پور۔

۳. جہلم۔

۴. مڑیالہ / جلال پور۔

۵. پتن وال۔

لفٹننٹ اسمتھ کی تحقیق کے مطابق جس کا حوالہ ٹائن بی نے بھی دیا ہے۔ سکندر کی افواج نے ۱۶ اور ۱۷ جولائی (۳۲۶ ق۔م) کی درمیانی رات دریا کو عبور کیا مگر بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ تحقیق غلط ہے وہ وسطِ مئی کے ایام تھے۔ اس سال بے موسمی بارشیں ہو رہی تھیں ارسٹوبلس ARISTOBOLOS لکھتا ہے کہ یونانی افواج ۳۲۶ ق م کے موسم بہار میں ٹیکسلا پہنچی تھیں اور ان کی آمد کے ساتھ بارشوں کا زور بھی شروع ہو گیا تھا یہاں تک کہ اس سال

سلسلۂ باراں، برکھا رُت سے جا ملا تھا۔

پہاڑوں کی چوٹیوں سے برفاب پگھل آیا تھا اور دریا کا بہاؤ شدت اختیار کر تا جاتا تھا۔

پورس کے دیکھ بھال کرنے والے دستے یونانی لشکر کی فرودگاہوں پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے انہیں وہاں ہر گوشہ میں نقل و حرکت کے آثار ملتے۔ جس کا مقصد پورس کو اس خوف میں مبتلا کرنا تھا کہ سکندر کسی وقت بھی اچانک سر پر آ دھمکے گا اور امرِ واقعہ بھی تھا کہ سکندر جلد از جلد فیصلہ کن جنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوصف پورس کو تذبذب میں مبتلا رکھنے کے لئے اس نے رسد کی لدی ہوئی بھاری گاڑیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

۱۶ جولائی کی شام ہی سے آسمان پر گہرے بادل چھانے لگے تھے۔ نصف شب کے ہنگام اندھیرا خوب گھنیرا ہو گیا تھا۔ سکندر نے فضا پر نگاہیں گاڑتے ہوئے محسوس کیا کہ مینہ اب برسا ہی چاہتا ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس زور سے بجلی چمکی اور کڑاکے کے ساتھ گرجی کہ دھرتی کی چھاتی دہل گئی۔ چھما چھم بارش ہونے لگی۔ دریا کی موجیں بجلی کے کوندے میں صاف ٹھاٹھیں مارتی نظر آ رہی تھیں۔ بارش تھی یا کوئی طوفان ــــ یا کسی مہجور کی آنکھوں کا بندِ سیلاب ٹوٹ گیا تھا۔ ادھر زمین جل تھل تھی۔ ادھر طغیانی کا کس بل ــــ مگر سکندر ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ اب رُکنا تدبیر کے منافی ہوتا۔ چنانچہ اس نے کشتیوں کو پانی میں اتارنے اور سپاہیوں کو دریا عبور کرنے کا حکم دیتے ہوئے کہا:

"اے ارضِ یونان کے دلیرو! آگے بڑھو کہ رُکنا ہماری آن نہیں۔ سکونِ حال تا بہ کے۔ گھڑی کی چال تا بہ کے۔ اے جانبازو تم ابر و برق و باد و باراں کے اس طوفان میں گواہ رہنا کہ تمہاری خاطر میں کتنی مصیبتیں جھیل رہا ہوں ــــ"

یہ الفاظ کہتے وقت سکندر کو یقین تھا کہ یہ سب کھیکھڑ وہ نام و نمود ہی کی خاطر کر رہا ہے اور یونانی پرچہ نویس جنہیں وہ بالارادہ ساتھ لایا ہے اپنے صحیفوں میں اس خبر کو محفوظ کریں گے۔

سکندر کی دفعتہً یورش کی خبر پورس اور اس کے لشکریوں کو آخر وقت تک معلوم نہ ہو سکی۔ مورخوں تک بھی یہ ساری تفصیل یونانی مصنفوں ہی کی لکھت سے پہنچی ہے۔

سکندر کے حکم کے ساتھ ہی کشتیاں پانی میں اتار دی گئیں اور وہ بپھری ہوئی موجوں سے ٹکراتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ حوصلہ مندوں نے خشمگیں لہروں کا منہ پھیر دیا۔ وقفے وقفے سے برق چمکتی تو دریا میں قمقمے روشن ہوجاتے جن کی چمک فتح مند یونانیوں کو مقدّر کا ستارہ بن کر کامرانی کا راستہ سجھاتی۔

یہ تمام طوفانی رات اسی رنگ سے گزری۔ سکندر کے گیارہ ہزار سپاہی پار اتر گئے۔ آخر میں ایک بڑا بجرا دریا کی سرکش موجوں سے ٹکراتا ہوا ساحل کی سمت بڑھتے لگا۔ اس میں خود سکندر اعظم اور اس کے چار چیدہ جرنیل سوار تھے۔

دارالپور[1] کے جس مقام سے سکندر نے دریا عبور کرنے کا فیصلہ کیا وہ غلط نہ تھا۔ یہ جگہ دریا کے ایک ٹاپو اور اس میں اُگے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی وجہ سے بائیں کنارے والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی۔ اگر یونانی دستوں کے ساحل پر لنگر انداز ہونے سے پہلے پورس کے سپاہیوں کو اس پیش قدمی کا علم ہوجاتا اور وہ اسی مقام کے متصل اپنے مورچے بنا لیتے تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔

---

[1] اتفاق کی بات ہے کہ اٹھارہ سو برس کے بعد بابر نے بھی دریائے جہلم کو اسی مقام سے عبور کیا جہاں سکندر اعظم نے دارالپور کے قریب اپنی کشتیاں دریا میں ڈالی تھیں۔

صبح دم معرکہ شروع ہوا۔ پورس کو اپنے ہاتھیوں اور یونانیوں کو اپنے رسالہ پر ناز تھا پورس نے اپنے ہاتھیوں کو اول صف میں کھڑا کیا تاکہ اُس کی صفوں کو چیر کر فوج کے قلب تک بآسانی نہ پہنچا جا سکے۔ پورس نے کسی دیوتا کا مقدس بت بھی اپنے دستوں کے جلو میں سجا رکھا تھا۔ ایک فربہ ہاتھی پر وہ خود سوار تھا۔ ڈھول اور تاشے بجائے جا رہے تھے۔

سکندر اعظم نے اپنے میمنہ اور میسرہ کو ترتیب دیا۔ خود میمنہ کی کمان سنبھالی۔ میسرہ اپنے معتمد جرنیل کوئینس Coenus کے سپرد کیا اور اسے ہدایت کی کہ بے تحاشا تیر برسا کر دشمن کی صفوں میں انتشار پیدا کر دے۔

مقابلے میں سب سے پہلے پورس کا بڑا بیٹا دو ہزار سپاہیوں کا رسالہ اور ایک سو بیس جنگی رتھوں کے ساتھ آگے بڑھا اور دیکھتے دیکھتے چار سو سپاہیوں کے ساتھ میدان میں کام آ گیا پھر اس کا دوسرا بیٹا بھی اسی طرح کھیت رہا۔

اب پورس خود کم و بیش چار ہزار سوار، تین سو رتھ اور تیس ہزار پیادہ فوج کو لے کر میدان میں اترا۔ لیکن اس کے ہاتھی ایکا ایکی بے قابو ہو کر افراتفری میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ان کے مہاوت فرش پر آ رہے اور کچلے گئے۔ بے شمار سپاہی بھی اس بھگدڑ کی لپیٹ میں آ گئے پورس کی فوج انتشار سے دوچار ہو گئی اور موثر دفاع کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اس وقت پورس کی سپاہ ایک بدحواس ہجوم کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ یونانی فوج نے ایک ہی ہلّے میں ان کے چھکے چھڑا دیئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ان بھگوڑوں کو یونانی فوج نے چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا۔ کم و بیش بارہ ہزار سپاہی مارے گئے جن میں پورس کے دو بیٹے اور کئی فوجی افسر بھی تھے۔ نو ہزار سپاہی گرفتار کر لئے گئے۔ اسی ہاتھی زندہ پکڑے گئے۔ سکندر کا نقصان چند سو سپاہیوں سے بیش نہ تھا۔

پورس کے دائیں شانے پر زخم آیا۔ اس نے اپنی فوج کی ابتری کا سارا تماشا اپنی آنکھوں

دیکھا مگر میدان سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اپنے وقار کے تحفظ کی خاطر اپنا فرض ادا کر دیا۔

سکندر کی فوج میں وسطی ایشیا کے ایک ہزار تیر اندازوں کا دستہ تھا جس نے حملہ میں پہل کی اور اندھا دھند تیر برسائے۔ اس کا مؤثر جواب پورس کے پاس بھی موجود تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس کے تیر اندازوں کی لمبی کمانوں کو بارش کی وجہ سے دلدلی زمین پر سہارا نہ مل سکا اور اس طرح کارکردگی دکھانے کا موقع ہی نہ ہوا۔

پورس گرفتار ہو گیا۔ اسے سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ سکندر کے سپاہیوں نے اسے پانی پلایا اور سکندر کے حضور لے گئے۔ سکندر اپنے خیمہ سے اچھلتا کودتا ہوا نکلا۔ اسے تپاک سے ملا۔ اپنے دور کے دو جری کمانڈر آمنے سامنے کھڑے تھے۔

٭ آئینہ ہے کر قاتل کے مقابل قاتل

سکندر کا سر فخر سے اونچا اور پورس شکست کی وجہ سے گہری سوچ میں تھا۔ ان دونوں میں ترجمان کی وساطت سے گفتگو ہوئی۔

سکندر نے پوچھا ــــ "کچھ تم ہی کہو تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟"

پورس نے جواب میں کہا ــــ "اے سکندر تمہارا سلوک بہر انداز ایسا ہونا چاہیئے جو مجھ ایسے بادشاہ کی شان کے شایان ہو۔"

سکندر بولا ــــ "ایسا میں اپنے لئے کروں یا تم اپنی خاطر سے اس کے طالب ہو۔ اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

پورس نے کہا ــــ لفظ "بادشاہ" میں میری بات کی وضاحت موجود ہے۔"

کہتے ہیں کہ سکندر اس کے جواب سے اتنا خوش ہوا کہ اسے معاف کر کے اپنا حلیف بنا لیا۔
سکندر اعظم دور کا مسافر تھا۔ پوٹھوہار کا علاقہ اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور ہے اس

سرزمین نے مہمان مسافر کے قدم چوم لئے اور بختاوری کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا — اس طرح پورس کا جاہ و جلال سکندر اعظم کی دنیا گیر عظمت کے حلقۂ دامان میں آ گیا مگر فتح و نصرت کے باوصف اس نے پورس کے ملک و مال کو بحال کرنے کا حکم دیا اور کچھ اور علاقہ بھی اسے بخشا گیا قتل اور جان بخشی بھی کی۔

امبھی اور پورس کی صلح کرائی۔ دونوں میں ازدواجی رشتے بھی ٹھہرائے۔ مگر یہ عنایات بلاوجہ نہ تھیں۔ پورس سے دوستی کر کے سکندر نے پنجاب بھر کے تمام راجواڑوں کی کمر ہمت توڑ ڈالی۔ کیونکہ پورس ہی ان سب میں طاقت ور شخصیت کا مالک تھا۔

پورس کو زیر کرنے کے بعد سکندر اعظم تیس روز تک جہلم میں رُکا۔ اسی دوران فتح کی خوشی میں دو نئے شہروں کی نیو بھی رکھی۔ ایک شہر اس جگہ کے قریب تعمیر کیا جہاں سے یونانی فوج نے دریا عبور کیا تھا اور اس شہر کا نام اپنے چہیتے گھوڑے کے نام پر بکفالہ رکھا۔ سکندر کا یہ وفادار گھوڑا لڑائی میں تکان کی وجہ سے جاں بحق ہو گیا تھا۔ دوسرے شہر کا نام نکیا رکھا اور اسے میدانِ جنگ سے ملحق تعمیر کیا۔

فتح کے شکرانے میں یونانیوں نے اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے جانوروں کو بھینٹ چڑھایا۔ گھڑ دوڑ، پہلوانی اور مکہ بازی کے مظاہرے ہوئے۔ سکندر اعظم نے خود سورج دیوتا کے نام پر قربانی پیش کر کے اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کئے اور کہا —

"اے شاہد خاور تیری ہی عنایات سے ہم یونانیوں پر ایوانِ مشرق کے دریچے وا ہوئے ہیں —"

کوہستانی علاقے کے حکمران سوبھوتی نے یہیں سکندر اعظم کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل کیا اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ سوبھوتی جاذب شخصیت کا مالک اور اپنے حسنِ انتظام کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتا تھا۔ اس نے سکندر کے اعزاز میں ایک ضیافت بھی کی اور اس کی تفریحِ طبع

کے لئے اپنے شکاری کتوں کی نمائش بھی لگائی جس سے سکندر بہت محظوظ ہوا۔ انہی میں وہ خونخوار نسل بھی شامل تھی جو کتے کو چیتے سے ملا کر حاصل کی جاتی ہے۔

ایک ماہ بعد جب بارشوں کے ایام نکل گئے تو سکندر نے جہلم سے آگے کوچ کیا۔ میں اس داستان کو یہیں ختم کرتا ہوں کہ اس کے بعد حالات کی تفصیل میرے موضوع سے خارج ہے۔

سکندر کے بعد

سکندر اعظم ۳۲۳ قبل مسیح میں راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔

یونانیوں کا طنطنۂ سکندری اور فتح کے اثرات سات برس کی مختصر مدت میں تمام ہوگئے۔ جگہ جگہ یونانیوں کے خلاف بغاوت شروع ہوگئی ــــ ان حالات کا چندر گپت موریا نے خاصہ فائدہ اٹھایا۔

چندر گپت موریا اگرچہ سکندر ایسا فاتح تو نہیں تھا مگر اس سے بڑا منتظم حکمران ضرور تھا وہ کشتری سردار تھا جسے مگدھ کے حکمران نندا خاندان نے راجدھانی سے بدر کر دیا تھا۔ اس نے اپنے مشیر چانکیہ کوٹلیہ کی مدد سے چھوٹا سا لشکر ترتیب دیا اور تاج و تخت پر قبضہ کر کے موریا خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس خاندان نے ڈیڑھ سو برس تک ہندوستان اور افغانستان پر حکومت کی اور یہ اپنے عہد کی مضبوط ترین سلطنت تھی۔

جواہر لال نہرو لکھتا ہے کہ "چندر گپت موریا اور چانکیہ نے سکندر اعظم کا تہوّر اور فاتحانہ یورش کے تیور دیکھے تھے جس سے ان میں ایسے عزائم بیدار ہوگئے تھے کہ انہوں نے سکندر کی موت کے بعد مختصر مدت میں یونانی گورنر کو شکست دے دی۔ اصل میں انہوں نے مقامی قومی جذبات کو ابھار کر بیرونی حملہ آوروں کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور ان پر فتح حاصل کی۔"

چندر گپت نے پاٹلی پتر (موجودہ پٹنہ) سے اٹھ کر اپنا پھریرا لہرایا اور خطۂ پوٹھوہار تک بڑھ آیا۔ سکندر کے جانشین سیلوکس نے اس سے صلح کر لی۔ میگستھنیز (MAGASTHENESE)

کو اپنا سفیر بنا کر پاٹلی پتر بھیجا۔ وہ انسانوں اور واقعات کا بالغ نظر مبصر تھا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ چندر گپت کے دورِ حکومت کے حالات کو قلمبند کیا ہے۔ اس نے سلطنت کے نظم و نسق، رعایا کی خوشحالی اور لوگوں کے اخلاق کو سراہا ہے اور عدل و انصاف کے محکم نظام کی بھی تعریف کی ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے چندر گپت کی طرف سے لگائی جانے والی عام کچہریوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

تاہم بعض مورخین کا خیال ہے کہ موریا سلطنت ایک مطلق العنان بادشاہی تھی جس نے پوری مملکت کے اقتصادی وسائل کو اپنی مٹھی میں دبا رکھا تھا۔ اس نے صرف راجدھانی کے اقتصادی اور سماجی امور کو کنٹرول کرنے کے لئے تیس آدمیوں پر مشتمل ایک بورڈ بنا رکھا تھا اور جاسوسی نظام کو پورے ملک میں پھیلا رکھا تھا۔

چندر گپت نے ۲۴ برس تک زوردار حکمرانی کی۔ پھر اس کا بیٹا بندوسار ۲۹۸ ق م میں تخت پر بیٹھا۔ اور اٹھائیس برس کے بعد مرا۔ اسی کے عہد میں ٹیکسلا کے عوام نے شورش بپا کی تو اس نے اپنے بیٹے اشوک کو وہاں بھیجا۔ ٹیکسلا کے شہریوں کا ایک وفد اشوک سے ملا اور کہا ہم نے یہ شورش نوکر شاہی کے خلاف بپا کی ہے ورنہ ہم مہاراج بندوسار کے بدستور وفادار ہیں۔

اشوک اپنے باپ کی موت تک پوٹھوہار کا گورنر رہا اور سلطنت کے انتظامی امور کا عملی تجربہ حاصل کیا۔ ۲۷۳ ق م میں خود تخت پر بیٹھا اور چالیس برس تک حکومت کی۔

اشوک نے اپنے عہدِ حکومت کے آغاز میں بدھ مت اختیار کر لیا۔ شکار کھیلنا اور گوشت کھانا ترک کر دیا۔ وہ رعیت کو اپنی اولاد سمجھتا اور اہنسو پر مودھرما کا شدت سے قائل تھا۔

اشوک نے بدھ مت کے پرچارک ہر سمت بھیجے اور پوٹھوہار میں بھی بدھ مت اسی دور میں پھیلا۔ آنے والے چند ہی سالوں میں ٹیکسلا بدھ مذہب کے علمی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا پوٹھوہار کے طول و عرض میں بہت سی خانقاہیں اور عبادت گاہیں کھولی گئیں اور اس طرح ایک

ایک نئی تہذیب نے جنم لیا جس کا مرکز ٹیکسلا تھا۔

چندر گپت موریا کا وزیر اعلیٰ چانکیہ آخری عمر میں ٹیکسلا آ گیا تھا اور یہیں مرا۔ وہ کوٹلی ستیاں کا رہنے والا فاضل برہمن تھا جس نے ٹیکسلا میں تعلیم پائی اور کوٹلی کی نسبت سے اُسے کوٹلیہ کہا جاتا ہے۔ وہ سیاسی اقتدار کا ماہر سکالر سمجھا جاتا ہے۔ اس عیار نے مذہب کے اخلاقی پہلو سے عمداً چشم پوشی کی وہ جوانی کے دنوں میں ٹیکسلا سے اپنے علم کا لوہا منوانے کے لئے پاٹلی پتر گیا تھا مگر وہاں کے نندہ بادشاہ نے اس کی توہین کی۔ اس توہین کا بدلہ لینے کے لئے اس نے چندر گپت کو حرب وضرب کی تعلیم و تربیت دے کر نندہ خاندان کے خلاف تیار کیا اور حکومت کا تختہ اُلٹا دیا۔

میکاولی کی طرح چانکیہ پر بھی پولیس ریاست کی تشکیل کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور کے آمروں کی طرح چانکیہ کا بھی عقیدہ تھا کہ ریاست کی بھلائی کے لئے سب ذرائع مباح ہیں۔ وہ فطرتاً باغی سرشت رکھتا تھا مگر اپنے بادشاہ کا وفادار تھا۔ اس کی کتاب "ارتھ شاستر" سنسکرت لٹریچر کی مانی ہوئی تصنیف ہے۔ چانکیہ کے آٹھ اصول تھے۔

۱۔ حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی سرد نہ ہونے پائے۔

۲۔ ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک کیا جائے جو دشمنوں سے کیا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پر کڑی نظر رکھنا چاہیئے۔

۳۔ غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے چاہیئں۔

۴۔ کسی سے دوستی بغیر غرض نہ رکھی جائے اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

۵۔ دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے اور ہر بہانے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں۔

۶۔ دوسرے علاقوں میں مخالفانہ پراپیگنڈہ، تخریبی کارروائیاں اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔

۷۔ دوسرے ملک کے غداروں کو خریدا جائے۔

۸۔ امن کے قیام کا دل میں خیال بھی نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا مجبور کرے۔

اشوک کے عہد حکومت میں شاہی خاندان ہی کا کوئی فرد پوٹھوار کا گورنر رہا، پنجاب اور کشمیر کا علاقہ بھی اسی کے زیر نگرانی تھا۔ اشوک کی موت کے وقت اس کا بیٹا جلو کا کشمیر کا حاکم تھا۔ ایک روایت کے مطابق اشوک ۲۳۲ ق م میں ٹیکسلا آیا ہوا تھا کہ بیمار پڑا اور مر گیا۔

موریا خاندان کے عہد حکومت میں برصغیر کے فن تعمیر اور سائنسی فکر میں یونانی اور ایرانی اثرات کا سراغ لگانا چنداں مشکل نہیں ہے۔ برہمنوں نے قدامت کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کی اور جدت کی طرح ڈالنے کا انہیں کبھی خیال نہیں آیا۔ تاہم یونانی طرز پر ہی چندر گپت موریا کے عہد سے جدت کا آغاز ہوا۔

یونانی اثرات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح کے جو سکے کوہستانِ نمک کے علاقوں سے برآمد ہوئے۔ ان پر یونانی چھاپ بالکل واضح ہے۔ عین انہی خطوط پر جو یونانی گورنر سیلوکس کے وقت رائج تھے۔ کوہستان نمک کے علاقے پر ان دنوں سوبھوتی حکمران تھا۔

یونانیوں کے علاوہ یکے بعد دیگرے کئی حملہ آور آئے اور گئے۔ ان کی حکمرانی کی مدت طویل رہی پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر کا شمال مغربی حصہ جس میں پوٹھوہار بھی شامل ہے۔ کشان خاندان کے دور حکومت تک یونانی آرٹ کے اثرات سے مبرا نہیں اور اس کا ثبوت وہ سکے تھیں جو بڑی تعداد میں پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے بعض حصوں سے ملے ہیں۔ ان سکوں سے بیاہی بادشاہوں کے نام تو معلوم ہو سکے مگر ان کے دور کے کوائف ابھی تک اندھیرے میں ہیں۔

اشوک کے عہد میں یونانیوں کے علاوہ ایرانی اثر بھی نظر آتا ہے جگہ جگہ ستونوں کی تعمیر اور چٹانوں پر کتبے کندہ کرانا ایران کے دارا عہد کی یادگار ہیں۔

موریا دور میں مغربی ایشیا اور دوسرے ممالک کے ساتھ ہونے والی تجارت کا اہم ترین مرکز ٹیکسلا رہا۔ اسی عہد میں ٹیکسلا سے پٹنہ تک سرکاری شاہراہ بنی اور اسی شاہراہ کو شیر شاہ سوری نے اپنے زمانہ میں دوبارا بنوایا۔ سایہ دار درخواست لگوائے کنویں کھدوائے سرائیں بنوائیں۔ موریا عہد میں ٹیکسلا سے کابل تک بھی ایک سڑک نکالی گئی۔

ٹیکسلا کو مرکزِ علوم و فنون کی حیثیت سے اشوک کے عہد میں بڑی شہرت ملی کہتے ہیں صرف اشوک کے زمانہ میں خواندگی کا تناسب موجودہ بھارت سے کہیں زیادہ تھا۔

موریا عہد میں زمینوں کی پیمائش ہوئی۔ زراعت کو ترقی دینے کے لئے کنویں اور نہریں کھدوائی گئیں۔ جنگلات پر توجہ دی گئی۔ بھیڑ بکریوں کی افزائش نسل کے ذرائع اختیار کئے گئے۔ باٹ پیمانوں کا نظام درست ہوا۔ چاندی اور تانبے کے سکے ڈھالنے کے لئے شاہی ٹکسالیں قائم ہوئیں۔

موریا سلطنت ڈیڑھ صدی تک قائم رہی۔ اشوک کے کمزور جانشینوں نے ایک بار پھر یونانی حملہ آوروں کو یورش پر اکسایا اور یونانی تہذیب و تمدن کے بیج بونے کی راہ ہموار کر دی۔ اس مرتبہ اینگلو بکٹرین نسل کے یونانی فاتح یہاں آئے اور کم و بیش ایک صدی تک حکمران رہے۔ ان کا دورِ حکومت دوسری صدی قبل مسیح تک چلتا ہے۔ ان کے طلسم کو ۹۰ ق م میں سیستان کے جنگجو قبیلے ساکا نے توڑا۔ اس قبیلے کے ایک حکمران ایرس اوّل (جو ۵۸ ق م میں حکمران بنا اور لمبی عمر پاکر مرا) کے عہد میں ساکا سلطنت کی حد یں جمنا کے کناروں تک وسیع ہو گئی تھی۔

ساکاؤں نے یونانیوں کے طرز حکومت کو اپنائے رکھا اور ان کے قائم کردہ سیاسی

اداروں اور تہذیب و تمدن کو ملیا میٹ نہیں کیا۔

پانچویں صدی ق م سے لے کر پانچویں صدی بعد مسیح تک تقریباً سات مختلف قومیں خطۂ پوٹھوہار پر قابض رہیں۔

ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ایرانی

۲۔ یونانی (مقدونیہ)

۳۔ موریا

۴۔ یونانی بکٹرین

۵۔ ساکا

۶۔ پارتھین

۷۔ کشان

ان ساتوں میں سے یونانی (مقدونیہ) کے مختصر ترین عہد کو چھوڑ کر بقیہ چھ نے اپنے اپنے عہد میں خطۂ پوٹھوہار کے فنون اور تہذیب و تمدن پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ایرانیوں کا دور کم و بیش دو سو برس کو محیط رہا۔ جب یہ خطہ ایرانیوں کے زیر تسلط آیا اس وقت ایران پر کیقباد حکمران تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ایرانیوں کے آثار یہاں اب کہیں باقی نہیں البتہ سفید مرمر کا ایک کتبہ ملا ہے جو کسی محل کی تعمیر سے متعلق ہے۔

۴۶۰ء میں سفید ہنوں کی یلغار نے اس علاقے کے پرانے نظام اور تہذیب و تمدن کو ملیا میٹ کر دیا۔ انہیں بدھ مت سے خدا واسطے کا بیر تھا چنانچہ اس مذہب سے متعلق ہر شے کو انہوں نے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

موریا سلطنت کے زوال کے بعد پانچ صدیاں ایسی گذریں کہ اس کی سرگزشت بہت

کم تاریخ نے محفوظ کی لیکن اس کے باوجود ہم ان صدیوں کو تاریک نہیں کہہ سکتے کیونکہ ٹیکسلا اور اس جیسی دوسری بہت سی درس گاہیں بدستور اپنے کام میں مصروف تھیں۔ بشگراشی میں یونانی رنگ نمایاں اور تعمیرات میں ایرانی تراش موجود رہی حتیٰ کہ پارتھین قبیلے کے عہد میں جو ۱۹ء میں برسر اقتدار آیا۔ سرکاری زبان یونانی ہی رہی۔ اگرچہ پارتھین کی اپنی زبان فارسی تھی۔

آگے چل کر جب کشان قبیلے کو فروغ ہوا تو اشوک کی طرح اس خاندان کا ایک فرد کنشک بھی اچھا بادشاہ ثابت ہوا۔ اس خاندان کی بنیاد کدارا شاہی نے رکھی تھی لیکن اس کے عروج کا زمانہ کنشک ہی کے دورِ حکومت سے عبارت ہے۔ وہ ۱۲۸ء میں تخت پر بیٹھا اور ۱۵۱ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اس کے عہد میں تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کو بڑا فروغ ہوا۔ تاریخی اعتبار سے سونے کے سکے پہلی مرتبہ اسی دور میں ڈھالے گئے اور تجارتی لین دین میں استعمال ہوئے۔

کنشک وسیع القلب حکمران تھا۔ خود بدھ مت کا پیرو تھا مگر دوسرے مذاہب سے اس کا رویہ معاندانہ نہیں تھا۔

۲۵۰ء کے لگ بھگ کشان خاندان پر زوال آگیا اور واسو دیوا کی رحلت کے بعد کشان خاندان کمزور پڑتا گیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ کشان خاندان کے زوال میں ساسانی حملوں کا ہاتھ بھی رہا ہوگا کیونکہ ٹیکسلا کے آثار کی کھدائی میں ساسانی عہد کے سکے بھی برآمد ہوئے ہیں۔

کنشک کے بعد کا دور پھر تاریکی میں چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ۳۱۹ء میں چندر گپت بکرماجیت کا دور آتا ہے لیکن وہ پورے پنجاب کو زیرنگیں نہ کر سکا۔ اس کے بیٹے سمدر گپت نے اپنے عہد میں پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور اس وقت ایک بار پھر خطہ پوٹھوہار پاٹلی پتر کے مرکز کے تحت آگیا۔ پھر سمدر گپت کے بیٹے کے عہد میں جب کہ گپتا خاندان کی حکومت پر ایک صدی گزر چکی تھی اس خاندان کی حکومت بحیرہ عرب کے ساحلی علاقوں تک پھیل گئی تھی اور مصر کے ساتھ براہ راست تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔

۵۵۵ء میں سفید ہُنوں نے پنجاب میں داخل ہو کر پرانے نظام اور تہذیب و تمدن کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ شہروں کو نذرِ آتش کیا اور قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ اس کارروائی میں انہیں گوجروں کی اعانت بھی حاصل رہی۔ انہوں نے بدھ مت کی تمام خانقاہوں کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا۔ ۵۳۰ء تک ان کا اقتدار باقی رہا۔ ان کا دارالخلافہ سیالکوٹ تھا۔

ہُنوں نے کابل اور کشمیر پر اپنا تسلط برقرار رکھا۔ ان کو گپتا خاندان کے وجے دھرمن نے موجودہ اسلام آباد کے وسیع میدان میں شکست دی اور ان کا بادشاہ مہارگلہ یا مہرگل اس جنگ میں کام آیا۔ اسی وجہ سے میدان جنگ سے ملحق پہاڑوں کے سلسلے کو مہارگلہ یا مارگلہ کہا جاتا ہے۔ شکست کے بعد ہُن دریائے جہلم عبور کر کے داولاکوٹ، پلندری، گڑھی دوپٹہ وغیرہ میں جا چھپے۔ ہو سکتا ہے کہ ان علاقوں کے سُدھن ہُنوں ہی کے اخلاف ہوں۔ بقیہ ہُن جو میدانی علاقوں میں رہ گئے یا تو ملیامیٹ ہوئے یا انہوں نے مویشی پالنا شروع کر دیئے۔ موجودہ گجر خود کو انہی کی نسل بتاتے ہیں۔

ہُنوں کے خاتمہ کے بعد پنجاب کی حکومت راجپوت سرداروں نے تقسیم کر لی جن میں سب سے زیادہ مشہور تین سردار تھے۔ ایک کا صدر مقام سیالکوٹ، دوسرے کا لاہور اور تیسرے کا گنجی پور (راولپنڈی) تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ پوٹھوہار کی صورت بھی بدلتی رہی۔ حملہ آور آتے اور جاتے رہے ٹیکسلا نیست و نابود ہوا۔ بدھ مت کی عبادت گاہیں، مندر، خانقاہیں اور وِہار بھی باقی نہ رہے۔ بُتوں کی خدائی کے اس زمانے میں صنعت آذری کے تراشے ہوئے پیکر ٹیکسلا کے عجائب گھر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن صنم پرستی کے پہلو بہ پہلو پوٹھوہار کی تہذیبی اور تمدنی ترقی کے آثار بھی کچھ کم نہیں ہیں جن سے اس علاقے کے تدریجی ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ بالخصوص ٹیکسلا یونیورسٹی کا قیام تمدنی عروج کا غماز ہے۔

مسلمانوں کی آمد

سلطان محمود غزنوی ۹۹۸ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے ہندوستان پر بارہ[12] یا بقول سر ہنری ایلیٹ سترہ بار حملے کئے۔ وہ ستمبر ۱۰۰۱ء میں پہلی بار حملہ آور ہوا اور جے پال کی فوجوں کے ساتھ چھچھ (حضرو) کے مقام پر ۲۷ نومبر ۱۰۰۱ء کو خونریز جنگ ہوئی جس میں جے پال کے پندرہ ہزار سپاہی مارے گئے۔ جے پال گرفتار ہو گیا۔

اس معرکہ سے فارغ ہوتے ہی محمود غزنوی نے اٹک سے پندرہ میل اوپر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع ایک اہم شہر اوہند پر بھی حملہ کیا

جے پال نے گرفتاری کے بعد چند شرائط پر ایک معاہدہ کر کے رہائی تو حاصل کر لی مگر شکست کی ندامت کے سبب آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود کر خودکشی کر لی۔

چند دن بعد اس کے بیٹے انند پال نے باپ کی گدی سنبھالی اور مسلمانوں سے مقابلہ کے لئے اجین، دہلی، گوالیار، قنوج اور اجمیر کے ہندو راجاؤں کی مشترکہ تنظیم بنائی جس کی کمان اجمیر کے چوہان راجہ وسالا دیو کے سپرد کی۔ پشاور اور اوہند کے درمیان ایک میدان میں محمود غزنوی نے ۴۰ روزہ کیمپ لگائے رکھا۔ اس دوران کوہسار کشمیر کی ترائی میں بسنے والے جنگجو قبیلہ کھوکھر کے تیس ہزار سپاہی ہندوؤں کی امداد کو آ گئے اور ۳۱ دسمبر کو اچانک حملہ کر دیا۔ یہ جنگلی لوگ سر اور پاؤں سے

ننگے تھے اور تیز رفتاری سے پیش قدمی کرتے ہوئے مسلمانوں کی خندقوں تک آ دھمکے۔ آنِ واحد میں تین چار ہزار مسلمان مارے گئے۔ قریب تھا کہ محمود غزنوی کا لشکر پسپا ہو جاتا مگر عین اس لمحہ قسمت نے یاوری کی اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ ہوا یہ کہ آنند پال کا ہاتھی میدانِ جنگ سے خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا۔ ہندو فوج نے خیال کیا کہ ان کا قائد میدان چھوڑ گیا۔ فوج میں ابتری پھیل گئی، آٹھ ہزار ہندو کھیت رہے اور بہت سارا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

چند برس اور نکل گئے۔ اندریں اثنا محمود غزنوی کئی بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ مگر اس کا نشانہ پنجاب نہیں بلکہ اور علاقے تھے۔

۱۰۱۳ء میں آنند پال کے بیٹے جے پال دوئم نے نندنہ میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کر لیا۔ چنانچہ اس کی گوشمالی کے لئے محمود غزنوی کو پوٹھوہار کا ایک پھیرا کرنا پڑا۔ محمود غزنوی کی پیش قدمی کا سنتے ہی جے پال دوئم نواحی پہاڑوں میں روپوش ہو گیا اور اپنے بڑے بیٹے بھیم پال کو سلطنت کا نگران مقرر کر دیا۔ بھیم پال کا لقب نڈر تھا۔ اس نے بڑی جی داری سے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ تاہم گرفتار نہ ہو سکا۔

محمود غزنوی نے سروغ نامی ایک شخص کو نندنہ کا نگران مقرر کر دیا۔ اصل میں جے پال نندنہ ہی کا رہنے والا جنجوعہ تھا۔ نندنہ کھیوڑہ کے قریب واقع ہے۔ اس کا موجودہ نام باغاں والا ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں البیرونی نے زمین کا قطر معلوم کیا تھا۔ یہ پیمائش اس قدر صحیح تھی کہ جدید اسلوب اور سائنسی سہولتوں کے اس دور میں دریافت کئے جانے والے قطر سے مقابلہ کیا گیا تو البیرونی کی تحقیق میں ۰.۱۹٪ کا فرق نکلا اور یہ کوئی خاص فرق بھی نہیں۔ اس سے پہلے مامون الرشید کے عہد میں دربار عباسیہ کا جغرافیہ دان اور ستارہ شناس ابوطیب بن علی جگہ کے غلط تعین کی وجہ سے اپنی کوششوں میں ناکام ہو چکا تھا۔

اسی مرحلہ پر گکھڑ قبیلہ کے سردار گکھڑ شاہ نے جو سلطان محمود کے لشکر کے ساتھ آیا تھا۔

حاکمیت کا پروانہ حاصل کر لیا۔ اس وثیقہ کی رو سے اٹک اور جہلم کا درمیانی علاقہ گکھڑوں کی سپرداری میں چلا گیا اور تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے جہاں سے گکھڑوں کی داستانِ رزم و بزم اور پوٹھوہار کی اہمیت کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن حالات اور واقعات کو جوڑ کر کوئی واضح تصویر مرتب کرنا آسان نہیں کیونکہ وقائع نگاروں نے بہت ہی کم مواد چھوڑا ہے۔

تاہم اتنا ضرور واضح ہے کہ محمود غزنوی کی آمد سے خطہ پوٹھوہار میں ایک نئی تہذیب ابھری جسے بہر نوع اسلامی کہا جا سکتا ہے۔ بدھ مت کا نشان تو صدیوں پہلے سفید ہنوں اور گوجروں نے مٹا دیا تھا تاہم برہمنی اقتدار کے سائے میں ہندو مذہب اپنی رنگا رنگ روایات سمیت موجود تھا۔ انہی میں سے لوگ دھیرے دھیرے اسلام قبول کرتے گئے۔

اورنگ زیب کی وفات تک پنجاب بھی برصغیر کے پندرہ صوبوں میں سے ایک تھا۔ جن دنوں مغلوں کا اقتدار آخری جھکولے کھا رہا تھا پنجاب میں جو قبیلے سربرآوردہ تھے ان میں اٹک اور جہلم کے مابین گکھڑ کوہستان نمک کے علاقے میں جنجوعہ اور اعوان۔ جھنگ میں سیال اور منٹگمری میں کھرل قابلِ ذکر ہیں (گکھڑوں کا تفصیلی احوال الگ باب میں تحریر کیا گیا ہے)

شہاب الدین محمد غوری

۱۱۹۳ء میں شہاب الدین محمد غوری نے لاہور پر حملہ کیا۔ محمود غزنوی کے کمزور جانشینوں نے گکھڑوں کی اعانت سے محمد غوری کے مقابلے کی تیاری شروع کر دی مگر سیالکوٹ کے قریب غزنوی اور گکھڑوں کے اجتماعی لشکر کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقعہ کے بعد گکھڑوں کے سردار سلطان منگ خان نے غوریوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا جسے محمد غوری کے نائب قطب الدین ایبک نے فرو کر دیا۔

۱۲۰۵ء میں کوہستانِ نمک کے کھوکھر قبیلے نے راجہ رائے سال کی قیادت میں محمد غوری کے خلاف

شورش بپا کی۔ راجہ رائے سال کچھ مدت پہلے اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہوگیا تھا۔ اس کے باغی دستوں نے لاہور کو لوٹا اور ملتان کے نائب گورنر کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خراج کی ادائیگی بند کردی۔ شہاب الدین محمد غوری ان کی سرکوبی کے لئے ۲۰ راکتوبر ۱۲۰۵ء کو خود یہاں آیا۔

محمد غوری کو ۸ رنومبر ۱۲۰۵ء تک پشاور میں رکنا پڑا۔ ۹ رنومبر کو وہ پشاور سے تیزی کے ساتھ کوچ کرتا ہوا کھوکھروں کے سر پر آدھمکا۔ جہلم اور چناب کے مابین کسی جگہ کھوکھروں نے مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ صبح سویرے جنگ کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں کھوکھر حاوی رہے۔ مگر دوپہر تک قطب الدین ایبک تازہ دستوں کی کمک لے کر پہنچ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کے کشتوں کے پشتے لگ گئے دو کھوکھر سردار جن کے نام سرکا اور باکان تھے پسپا ہوکر کوہستان نمک کے ایک قلعہ میں پناہ گزین ہوگئے مگر مسلمانوں کے لشکر نے تعاقب کرکے ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔ چند شوریدہ سر باغیوں کی ایک جماعت قلعہ سے نکل کر ایک قریبی گھنے جنگل میں جا چھپی۔ مسلمانوں نے جنگل کو آگ لگادی اور باغی اندر ہی جل کر بھسم ہوگئے۔

علاقہ کے انتظام و انصرام کے بعد فروری ۱۲۰۵ء میں محمد غوری نے واپسی کا قصد کیا مگر راستے میں سوہاوہ (ضلع جہلم) چند میل دور شمال کی جانب موضع دھمیک میں قتل ہوگیا۔

اس قتل کے بارے میں متعدد روایات ہیں:۔

ازاں جملہ ہندو تاریخ والوں کا خیال ہے کہ دہلی اور اجمیر کا راجہ پرتھوی راج جو ترائوڑی کے میدان میں زخمی ہونے کے بعد گرفتار کرلیا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھوڑنے کے بعد شہاب الدین محمد غوری کے حکم سے اسے اہم جنگی قیدی کی حیثیت سے لشکر اسلام کے ساتھ رکھا گیا۔ اس نے ایک روز موقع پاکر محمد غوری کو قتل کردیا۔ یہ روایت ہندوؤں کی خوش فہمی سے بیش نہیں اور پایہ اعتبار سے ساقط ہے کیونکہ مسلمانوں کا اپنے لشکر میں اندھے ہندو قیدی کو مہمات کے دوران ساتھ لئے پھرنا بعید از قیاس بات ہے۔ پرتھوی راج تراوڑی کے میدان میں گرفتار ہونے کے بعد ہی فی النار ہوچکا تھا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ ہزیمت خوردہ کھوکھروں نے محمد غوری کو انتقاماً قتل کیا تھا۔

ولسنٹ اسمتھ ان دونوں روایتوں سے الگ یہ واقعہ بیان کرتا ہے کہ فرقہ ملاحدہ کے ایک اسمٰعیلی نوجوان نے محمد غوری کو قتل کیا۔ سر ولزلے ہیگ کا خیال ہے کہ بیس پُرجوش اور جواں سال اسمٰعیلیوں نے یہ کام انجام دیا تھا کیونکہ انہوں نے اپنے فرقہ پر غوریوں کی یلغار اور بے پناہ مار کا انتقام لینے کا حلف اٹھا رکھا تھا اور تعاقب میں یہاں تک آپہنچے۔ تاک میں رہے اور موقع پاکر اپنا کام کر گزرے۔

"شہاب الدین اوائل شعبان ۶۰۲ ہجری کو قتل ہوا۔ اس کا جنازہ غزنی لے جایا گیا۔ جہاں وہ مدرسۂ شاہی میں ۲۲ر شعبان کو دفن کیا گیا۔" تاریخ ابنِ خلدون جلد ششم ص ۳۴۳۔

"محمد غوری دریائے سندھ کے کنارے قتل کیا گیا اور مؤید الملک نے لاش کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اٹھایا اور غزنی لے گئے ۲۲ر شعبان کو اپنے آقا کا جنازہ لئے ہوئے یہ لوگ غزنی میں داخل ہوئے اور سلطان کی لاش کو اس عمارت میں دفن کیا جو اس نے اپنی بیٹی کے لئے بنوائی تھی۔"

تاریخ فرشتہ جلد اول مقالہ دوم ص ۲۴۷

تین چار برس سے اخباروں میں یہ قصہ چل رہا ہے کہ محمد غوری کو گکھڑوں نے انتقاماً قتل کیا تھا۔ اور اس کی قبر اب "ٹمک دھمیک" میں موجود ہے ـــــ قبریں تو بستیوں کے پہلو میں ہر جگہ موجود ہوتی ہیں کیونکہ آبادیاں سمٹ سمٹا کر قبرستانوں ہی کی طرف جاتی ہیں۔ مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ موضع "دھمیک" میں جو قبر ہے اس میں کون دفن ہے؟ محمد غوری یا کوئی اور؟

وَلَوْ فَرَضْنا اگر گکھڑوں نے یہ قتل کیا تھا تو پھر بڑی ہی فراخدلانہ حماقت سے کام لیا کہ دشمن کو قتل کر کے اپنی سرزمین میں دفن ہونے کے لئے قبر کی جگہ بھی مہیا کر دی بلکہ غوری لشکر کی مراجعت کے بعد بھی قبر کا نام و نشان مٹنے نہیں دیا تاکہ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخی اہمیت روز افزوں رہے۔

اصل میں انگریز مصنفین نے کھوکھر کے بجائے "گکھڑ" لکھنے کا جو سہو تاریخ فرشتہ کے اتباع میں ہوا تھا اس سے یہ غلطی ہائے مضامین پیدا ہوئی۔ ورنہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ اس زمانے تک جہلم اور چناب کے مابین گکھڑوں کو نہ تو اقتدار حاصل تھا اور نہ ہی وہ اس رقبہ میں آباد تھے نہ انہوں نے جہلم اور چناب کے مابین مورچہ بندی کی ـــــ یوں بھی غور کرنے سے ایک اور بات سے میرے استدلال کو تقویت پہنچتی ہے کہ رائے شال، سرکا اور باکان کبھی گکھڑ سرداروں کے نام نہیں رہے۔ آخری بات یہ کہ جنرل کننگھم کی رپورٹ کے مطابق کھوکھروں کی غالب تعداد آج بھی جہلم اور چناب ہی کے مابین آباد ہے۔

ان تمام باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موضع "دھمیک" میں محمد غوری کی قبر کا افسانہ گھڑنے میں شاعری سے کام لیا گیا ہے اور شاعری بھی ایسی یتیم جو نثری شعر کی طرح لغو، مُہمل اور خارج از بحر ہے۔

راج کریگا خالصہ

پنجاب میں سکھا شاہی کا دور تاریخ عالم کے اسٹیج پر کھیلا جانے والا خونیں ڈرامہ تھا یہ غلط بخشی تھی یا اللہ کریم نے اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ بہرحال پنجاب کا ماضی تو بھگت چکا۔ اگرچہ پنجابیوں کی نفسیات پر اس کے اثرات کی پرچھائیاں ابھی تک موجود ہیں جن کی تفصیل میں اترنا اس کتاب کا موضوع نہیں۔

آغاز میں سکھ محض مذہبی گروہ تھے پھر انہوں نے سیاسی جتھہ بندی کر کے مغلوں کے اخیر عہد میں مرہٹوں کی طرح لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو ہندوستان پہنچا۔ پوٹھوہار کے جیالے غازیوں کے دستے بھی سلطان مقرب خان کی قیادت میں ابدالی لشکر کے ساتھ محاذ کی طرف روانہ ہوئے۔ مرہٹوں کا سردار دتا جی اسی ہزار سپاہیوں کا لشکرِ جرار لے کر مقابلے کی خاطر نکلا۔ سرہند کے قریب مرہٹوں کو پہلی شکست کا سامنا ہوا۔ اس کے بعد ہلکر ملہار راؤ مزید کمک لے کر پہنچ گیا اور پانی پت کے میدان میں تاریخی معرکہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ڈھائی ماہ تک اِکا دکا جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو مرہٹوں کو عبرت ناک شکست کھا کر منتشر ہونا پڑا۔ مرہٹوں کے پیشوا بالاجی کا بیٹا بسواس راؤ جسے یہ کفار ہندوستان کا بادشاہ بنانے کی فکر میں تھے۔ میدان میں قتل ہوا۔ مرہٹوں کا سپہ سالار بھاؤ اور دوسرے کئی بڑے بڑے سردار بھی قتل ہوئے۔

اس شکست کا ایسا گھاؤ لگا کہ مرہٹوں کا پیشوا بالاجی صدمہ کی تاب نہ لاکر مرگیا۔ مشہور ہندو مورخ سر جادو ناتھ سرکار لکھتا ہے کہ "مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صفِ ماتم نہ بچھی ہو مرہٹہ لیڈروں کی ایک پوری نسل ایک ہی ہلّے میں مسلمانوں نے ختم کر کے رکھ دی "

مگر ابدالی کا پھیرا ساون کا بادل تھی۔ گرجا، برسا اور نکل گیا۔ اسے واپس جانے کی بہت عجلت تھی۔ تاریخ کا یہی وہ لمحہ ہے جس کے بعد سکھوں نے بڑے زور کی اڑان لی اور پنجاب بھر میں جگہ جگہ جتھہ بندی اور قلعے تعمیر کر کے مسلمانوں کے خلاف مضبوط محاذ قائم کر لیا۔

۱۷۶۴ء میں احمد شاہ ابدالی کو سکھوں کی شوریدہ سری سے نمٹنے کا خیال آیا۔ پوٹھوہار کے سلطان مقرب خان کے جیالے دستوں کی اعانت سے ابدالی لاہور کی طرف بڑھا اور بڑھتا چلا گیا۔ لدھیانہ کے قریب زور کا معرکہ ہوا جس میں مبلغ بیس ہزار سکھ واہگورو کو پیارے ہو گئے ـــــ احمد شاہ ابدالی کو اب کے بھی بہت عجلت رہی اس نے ایک ہندو کابلی مل کو لاہور کا گورنر مقرر کر کے واپسی کا قصد کیا۔

ادھر ابدالی نے اٹک عبور کیا ادھر سکھ جتھوں نے کابلی مل کو بڑی آسانی کے ساتھ چلتا کیا۔ داتا کی نگری میں ست سری اکال کے نعروں کی گونج سنائی دینے لگی۔ مختلف سکھ جتھہ دار امرتسر میں جمع ہوئے اور اپنے اقتدار کا اعلان کیا اور چناب سے ہانسی تک علاقہ آپس میں بانٹ لیا۔ اپنے اپنے جتھے کو یہ لوگ مثل کہتے تھے اور تمام مثلیں مل کر ایک خالصہ کامن ویلتھ کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ یہ مثلیں تعداد میں بارہ تھیں اور ان سب کا مقصد ایک تھا یعنی مسلمانوں کو غلامی کے شکنجوں میں کس دینا۔ ان جتھہ داروں نے امرتسر دربار میں حلف اٹھانے کے بعد اپنا متفقہ سکہ رائج کیا جس پر فارسی کی یہ عبارت لکھوائی ـــــ

دیگ و تیغ و فتح نصرت بے درنگ
یافت از نانک گورو گوبند سنگھ!

آغاز میں ان مثلوں میں بھنگی مثل سب سے زیادہ طاقت ور تھی۔ بھنگ کی سردائی گھوٹ کر پیتے تھے۔ اس لئے ان کو بھنگی کہا جاتا تھا۔ اس مثل کا صدر مقام امرتسر تھا۔

اس وقت اٹک سے چناب تک گکھڑوں کے زیرنگیں تھا۔ ان سرداروں میں سلطان مقرب خان نے احمد شاہ ابدالی کے حملوں میں اس کا ساتھ دیا تھا اور احمد شاہ ابدالی کے دل میں مقرب خان کی خاصی قدر و منزلت تھی۔ تاریخی اعتبار سے گکھڑوں کا یہ آخری آزاد اور خود مختار سردار تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس کو "نواب" کے خطاب سے نوازا اور اٹک سے چناب کے مابین علاقہ پر اس کے تسلط کی توثیق کر دی تھی۔

احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے اک برس بعد یعنی ۱۷۶۵ء میں گوجر سنگھ بھنگی نے گجرات کے قریب سلطان مقرب خان کو شکست دے دی اور سکھوں کے ایک حلیف ہمت خان ڈومیلی والا نے شہید کر دیا۔ اسی اثنا میں احمد شاہ ابدالی کو اطلاع ہوئی تو اس نے نواب سربلند خان کو بھیجا سربلند خان کوئی کارنامہ نمایاں نہ کر سکا۔ سکھ دریائے جہلم کو عبور کر آئے۔ سربلند خان اور سلطان مقرب خان کے دو بیٹوں نادر علی خان اور اسداللہ خان کو رہتاس قلعہ میں بند ہونا پڑا لیکن بالآخر شکست کا سامنا ہو گیا۔ اس طرح سلطان مقرب خان کی شہادت کے بعد سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ رہا۔ تاہم مقرب خان کے بیٹے دانگلی اور پھروالہ میں قائم رہے لیکن جب ان میں بھی باہمی نفاق نے راہ پالی تو گوجر سنگھ نے پھروالہ کے علاوہ سارے علاقے ان سے چھین لئے۔ پھروالہ کو بھائیوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ اسداللہ خان اور نادر علی خان لاولد مرے منصور خان اور شادمان خان ان کے وارث قرار پائے اور ۱۸۱۸ء میں آنند سنگھ تھیپوریا نے سارے علاقہ پر قبضہ جما کر انہیں بے دخل کر دیا تاہم ۱۸۲۶ء میں کچھ جائداد ان کے نام واگذار ہو گئی

۲۷ نومبر ۱۷۹۸ء کو احمد شاہ ابدالی کا پوتا شاہ زمان حملہ آور ہوا اور جوگی والا پھیرا لگا کر پلٹ گیا۔ واپسی پر دریائے جہلم کو عبور کرتے ہوئے اس کی بارہ توپیں غرقاب ہو گئیں۔ رنجیت سنگھ نے ان

میں سے آٹھ نکلوا کر شاہ زمان کو پشاور بھجوا دیں اور اس کے صلے میں لاہور کی حاکیت کا پروانہ حاصل کر لیا۔
اس طرح تقدیر کی ستم ظریفی اور شاہ زمان کی سیر چشمی اور دریا دلی نے پنجاب کی حکومت سکھوں کے کشکولِ گدا میں ڈال کر نصف صدی کے لئے کفر کی تلوار کو کھلی چھٹی دلوا دی۔ جولائی ۹۹، ا رکو رنجیت سنگھ جوان دلوں گوجرانوالیہ مثل کا سردار تھا۔ لاہور میں داخل ہوا۔ لیکن اس وقت تک اس کی حیثیت جتھہ دار سے بیش نہ تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ قدم جمانے شروع کئے۔ کاسہ لیسوں کی جمعیت اپنے گرد اکٹھی کر لی اور یکم بیساکھ بمطابق ۱۲ اپریل ۱۸۰۱ کو ایک دربار عام منعقد کر کے "مہاراج" کا لقب دھار لیا۔ زمام حکومت ہاتھوں میں لے کر نانک شاہی سکہ رائج کیا اور سکہ ڈھالنے کی ٹکسال پنڈ دادن خان میں کھولی۔
کچھ وقت گذرا تھا کہ کانگڑہ کی وادی کو زیر کرنے کے بعد رنجیت سنگھ ترن تارن کے گوردوارہ سے ملحق تالاب میں اشنان کرنے کے لئے ٹھہرا۔ یہیں اسے ایک اور جتھہ دار فتح سنگھ آہلو والیہ آکر ملا۔ ہزاروں سکھوں کی موجودگی میں ان دونوں نے آپس میں پگڑیاں تبدیل کیں اور ایک دوسرے کے "دھرم بھائی" بن گئے۔ یہیں ان کے مابین ایک تحریری اقرار نامہ ہوا جس کی رو سے انہوں نے ایک دوسرے کا حلیف بننے کا پختہ عہد کیا اور طے پایا کہ وہ ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے اور ہر تازہ فتح حاصل کرنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے حلیف فتح سنگھ آہلو والیہ کو ایک ضلع بطور انعام دیا کرے گا۔
اس معاہدہ کے چند روز بعد فتح سنگھ آہلو والیہ لاہور آیا۔ دربار میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور شاہی طریق کے مطابق توپیں داغی گئیں۔ لاہور سے یہ دونوں پنجاب کے مغربی حصوں کی طرف روانہ ہوئے اور بچے کھچے مسلمان جاگیرداروں کو نئی سکھ ریاست سے غلامانہ الحاق پر مجبور کیا پنڈی بھٹیاں کے جاگیردار نے اطاعت قبول کرتے ہوئے چار سو اعلیٰ نسل کے گھوڑے نذر کئے۔ اس کے بعد سکھوں کے لشکر نے جہلم کو عبور کر کے راولپنڈی کے ان نواحی حصوں کو جو ابھی گکھڑوں

کے قبضہ میں تھے سکھ ریاست میں شامل کرنے کا اعلان کیا نیز کیمبل پور کے اضلاع کو بھی مطیع کیا اور ترن تارن کے معاہدہ کے مطابق پنڈی اور کیمبل پور کے مضافات کو فتح سنگھ آہلو والیہ کے حوالے کر دیا۔

ادھر کابل میں احمد شاہ ابدالی کے تین پوتوں یعنی شاہ زمان شاہ شجاع اور شاہ محمود میں ٹھنی ہوئی تھی۔ شاہ محمود نے شاہ زمان کو گرفتار کر کے اس کی آنکھیں نکلوادی تھیں۔ شاہ زمان امداد کی امید میں پشاور آگیا تھا اس کے پیچھے پیچھے شاہ شجاع بھی آیا اور رنجیت سنگھ سے رہتاس کے قلعہ میں ملاقات ہوئی۔ رنجیت سنگھ مدد تو کیا کرتا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا اور راولپنڈی میں بال بچوں سمیت رہنے کی اجازت دے دی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ پنڈی میں اس مکان کا پتہ چلاؤں جہاں شاہ شجاع اور اس کی اہلیہ وفا بیگم اپنے بچوں اور نوکروں کے ساتھ مقیم رہے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ شاہ شجاع اس دوران اپنے نابینا بھائی شاہ زمان سے ملنے لُٹ ور بھی گیا۔ مگر نتیجہ معلوم۔ بس ایک موہوم امید کے سہارے ابدالی کے پوتے حالات کے سمندر کی لہروں کے سینے پر بہتے چلے جاتے تھے۔ میاں محمد بخش صاحبؒ کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

نیچاں دی اشنائی کولوں کسے نئیں پھل پایا
ککر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

چند ماہ بعد رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع کو لاہور بلوا لیا اور ابوالفضل کی تعمیر کردہ "مبارک حویلی" میں ٹھہرانے کا انتظام کیا۔ جس وقت شاہ شجاع راولپنڈی سے لاہور پہنچا تو رنجیت سنگھ اپنے معتمد درباریوں کی معیت میں مبارک حویلی کے باہر منتظر تھا۔ خوش آمدید کہہ کر ایک ہزار روپے شاہ شجاع کی نذر کئے مگر ؎

اگر دشمن دوتا گردد ز تعظیمش مشو ایمن!
کماں چنداں کہ خم گردد خدنگش راست می آید

اصل میں یہ مہمان نوازی شاہ شجاع کی نظر بندی کا ابتدائیہ تھا شیر لوہے کے جال میں پھنس چکا تھا ـــــ بات یہ تھی کہ دنیا کا بیش قیمت ہیرا کوہِ نور، شاہ شجاع کے پاس تھا اور رنجیت سنگھ کو کسی گیانی نے خبر دی تھی کہ یہ ہیرا جس کسی کے پاس ہوتا ہے وہی پورے ملک کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ پہلے چند ماہ تک درمیان داروں کے ذریعہ بات چیت ہوتی رہی۔ حیلوں حوالوں سے کام نہ چلا تو ساڑھے چالیس لاکھ روپے کی رقم کا لالچ دیا پھر آخر کار ایک روز رنجیت سنگھ اپنی خالصہ فورس لے کر مبارک حویلی آیا اور شاہ شجاع کو بگڑے ہوئے تیور دکھا کر ہیرا حاصل کر کے شکریہ ادا کئے بغیر چلتا بنا۔

مگر بات یہیں ختم نہ ہو گئی۔ دو برس بعد رنجیت سنگھ نے اس مسافر خاندان کی بچی کھچی دولت بھی چھین لینے کا منصوبہ بنایا۔ یہ شاہ شجاع کے لعل و جواہرات تھے جن کی قیمت تخمیناً تیس لاکھ روپے بنتی تھی۔ ۴ مارچ ۱۸۱۴ء کو رنجیت سنگھ نے اپنے مدار المہام رام سنگھ کے ساتھ پانچ دبنگ اور غنڈے سکھنیوں کو مبارک حویلی بھیجا اور تمام زر و جواہر طلب کئے عورتیں حویلی کے زنان خانے میں داخل ہو گئیں۔ تمام زیورات ہیرے موتی۔ بیش بہا نوادرات کے صندوقچے اور قالین وغیرہ اٹھائے گئیں ـــــ

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند!
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ!

شاہ شجاع اس روز بے محابا رویا۔ کئی روز تک اس غم میں کچھ کھایا نہ پیا۔ پیشانی کی لکھت کو کون ٹال سکتا ہے۔

یوں مبارک حویلی والے مسافر، مال و متاع سے ہاتھ دھو کر جب عید مسیت ہو گئے تو رنجیت سنگھ نے پہرہ داروں کی تعداد میں کمی کر دی جس سے مکینوں کو اندر باہر آنے جانے کی آسانیاں حاصل ہو گئیں۔

نومبر ۱۸۱۴ء میں وفا بیگم لاہور سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی اور پانچ ماہ بعد شاہ شجاع بھی اپنے بیٹوں کے ساتھ لاہور سے بھاگ نکلا۔

اس فرار کی داستان یہ بیان کی جاتی ہے کہ شاہ شجاع اور اس کے جاں نثار خدام نے زیرِ زمین سرنگ کھودی جو حویلی کے ایک کمرے سے شروع ہوئی اور شہر کے مرکزی گندے نالے کے سرے پر جا نکلی فرار کی رات ایک خدمت گار نے شاہ کا لباس پہنا اور اس کے بستر پر لیٹ گیا۔ شاہ شجاع اپنے دو بیٹوں کے ساتھ سرنگ پار کر کے شہر کے باہر نکلا جہاں سواری اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ پہلے اس نے سیالکوٹ کا رخ کیا۔ وہاں سے پہاڑی راستوں کو عبور کرتا ہوا شملہ جا پہنچا اور وہاں سے لدھیانہ آگیا جہاں وفا بیگم موجود تھی۔

۱۸۰۹ء کے معاہدہ کی رو سے — لدھیانہ انگریزوں کی عملداری میں تھا۔

۱۸۱۹ء میں سکھوں نے کشمیر کو بھی فتح کر لیا۔ اس حملہ کا سارا اہتمام قلعہ رہتاس میں ہوا۔ فوجیں قلعہ سے نکل کر شوپیاں کی طرف چل پڑیں۔ اس لشکر کی کمان رنجیت سنگھ خود کر رہا تھا۔

پنجاب کے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی داستانیں برصغیر میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ ۱۸۲۱ء میں سید احمدؒ بریلویؒ اور ان کے رفقا نے ان درندوں کے خلاف دہلی کی فتح پوری مسجد میں جہاد کی تحریک کے مبادیات طے کئے اور ایک طویل دورے کے بعد اکوڑہ خٹک کے قریب سکھوں سے جہاد شروع کر دیا۔

۱۸۲۶ء میں ان مجاہدین نے پشاور، ریاست امب دربند اور ہزارہ کا علاقہ سکھوں سے آزاد کرالیا۔ ان سرفروشوں میں پوٹھوہار کے گکھڑ راجہ جہانداد اور اس کے فوجی دستوں کے علاوہ مشہور خانقاہ بشندور شریف کے سجادہ نشین اور ان کے مریدانِ باصفا بھی شریک ہوئے اس بارے میں مزید تفصیل میں نے الگ باب میں لکھ دی ہے۔ قارئین وہاں ملاحظہ کریں۔

جون ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ مر گیا۔

پھر آنے والے دس سال بدکردار سکھ مرد و زن سازشیوں کی آپا دھاپی میں نکل گئے اور بالآخر مارچ ۱۸۴۹ء میں گجرات کے مقام پر انگریزوں نے سکھوں کو آخری شکست دے دی ۱۴ مارچ ۱۸۴۹ء کو شیر سنگھ اور اس کے باپ چھتر سنگھ نے راولپنڈی میں شکست نامہ پر دستخط کرتے ہوئے اپنی کرپانیں جنرل گلبرٹ کی میز پر رکھ دیں۔ اکتالیس توپیں اور سولہ ہزار بندوقیں بھی انگریزوں کے حوالے کیں۔ ایک سکھ فوجی نے اسی موقع پر کہا تھا: "اج مہاراج رنجیت سنگھ ہوری مو۔ ئے نیں"۔

لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب سے سکھا شاہی کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ کم سن پرنس دلیپ سنگھ کے لئے چالیس ہزار پاؤنڈ سالانہ کا وظیفہ مقرر ہوا اور اسے انگلینڈ لے جایا گیا۔ وہ سکھ جاگیردار جنہوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا، بدستور اپنی جاگیروں کے مالک رہے۔ دوسری قیمتی چیزوں کے علاوہ "کوہِ نور" ہیرا بھی رنجیت سنگھ کے خزانے سے حاصل کر کے انگلستان بھیجا گیا۔

پوٹھوہار میں سکھوں کا دور اگرچہ بہت مختصر تھا مگر اقتدار پا کر انہوں نے مسلمانوں کو دل کھول کر ذلیل کیا۔ شرفاء کو گدائے بے نوا بنا کر رکھ دیا مسجدوں میں گھوڑے باندھے اور خوف و ہراس کی عملداری قائم کی جگہ جگہ قلعے اور حفاظتی چوکیاں قائم کیں۔ راولپنڈی چھاؤنی میں موجودہ جنرل پوسٹ آفس کی جگہ سکھوں کا فوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان کا گورنر بھائی مان سنگھ دھمیال میں رہتا تھا۔

گولڑہ شریف میں بھی سکھوں کی ایک قلعہ نما چوکی تھی جس کے کھنڈر گولڑہ شریف سے مغرب کی جانب کچھ دور ندی کے کنارے ابھی موجود ہیں۔ گولڑہ کے سہال خاندان کے کچھ افراد سکھ دربار کے منشی وغیرہ تھے۔

یہاں گولڑہ شریف کے حوالہ سے خالصہ عہد میں عدل و انصاف کا ایک بے مثال واقعہ درج

کرنا بے عمل نہ ہوگا۔ یہ واقعہ حضرت پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت نذر الدین صاحبؒ سے متعلق ہے۔ ہوا یہ کہ سکھ قلعدار کی ایک رشتہ دار لڑکی بدچلنی کے کارن اُمید سے پائی گئی۔ قلعدار کی تشویش قدرتی بات تھی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گولڑہ ہی کے ایک بد باطن مسلمان نے جو سادات سے کینہ رکھتا تھا سید نذر الدین صاحبؒ کے خلاف مخبری کی اور انہیں متہم گردانا۔ سکھ قلعدار نے سوچے سمجھے بغیر سید صاحب کو گرفتار کر کے آگ میں جلا دینے کا حکم صادر کر دیا۔ شرارِ بولہبی کا چراغِ مصطفویؐ سے ستیزہ کار ہونا اسی کو کہتے ہیں۔ وہ سید نذر الدین صاحبؒ کے شباب کا زمانہ تھا اور پاکبازی کا شہرہ بھی عام تھا۔ مگر اس صریح ظلم کے خلاف احتجاج کرتا تو کون؟ سزا کے دن مرد و زن تماشائی ہوئے۔ وقت کے نمرود نے اپنے غضب کا الاؤ بھڑکایا۔ سید صاحبؒ نے تہجد کے وقت غسل فرما کر اُجلا لباس زیب تن کر لیا تھا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح جگمگا رہا تھا۔ کالی زلفیں قلب بیدار اور اللہ اللہ کی تکرار سے لہرا رہی تھیں۔ دیکھنے والوں نے حیرت سے یہ دیکھا کہ یہ نارِ نمرود کے ملتہب شعلے بحکم ربانی سلامتی کے ساتھ ٹھنڈے ہو گئے۔ مجمع میں شہیدِ کربلا حسین علیہ السلام کے بیٹے کی بے گناہی کا غلغلہ بلند ہوا۔ سکھ قلعدار نے حکم دیا کہ مخبر کو حاضر کر کے اسی چتا پر آگ کے حوالے کیا جائے مگر سید نذر الدین صاحبؒ نے کہا جب تک اسے معافی نہیں دی جائے گی میں چتا سے نہیں اتروں گا۔ خون کے پیاسوں کو عفو سے نوازنے والے خانوادہ کی عظمت کو سلام۔

یہ سکھوں کے عہد میں عدل و انصاف کی حالت تھی کہ مقدمہ چلائے بغیر اندھا دھند سزائیں سنا دیا کرتے تھے۔

سکھوں کے چار گڑھ بہت مشہور تھے۔

۱۔ سکھو۔

۲۔ کلر سیداں۔

۴. ڈیرہ خالصہ۔ ـــــــ اس گاؤں سے ایک میل اُوپر ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اس کے آثار موجود ہیں۔ یہاں ایک سکھ جرنیل کی رہائش تھی۔ محلات، بارہ دریاں، باغات بھی یہاں موجود تھے۔ ۱۸۶۰ء میں انگریزوں نے ایک پٹھان غزن خان کو مردان میں کوئی خدمت انجام دینے کے انعام میں یہ گاؤں بطور جاگیر بخش دیا تھا۔ اس نے اس کا نام غزن آباد" رکھا قلعہ کا ساز و سامان ۱۹۲۴ء میں انگریزوں نے نیلام کرایا اور ہندوؤں نے خوب روپیہ کمایا۔

سکھوں کی اپنی ایک معاشرت تھی۔ وہ ہندوؤں میں شامل تھے اور ان سے باہر بھی تھے ان کا لباس ہندوؤں سے یکسر مختلف تھا۔ علانیہ جھٹکا کھاتے اور شراب پی کر بھنگڑا ناچتے۔ ان کے معبد بُت کدے نہیں تھے بلکہ وہاں گرنتھ صاحب پڑھا جاتا اور باجے گاجے کے ساتھ چند رسومات ادا کی جاتیں۔ کڑاہ پرشاد ان رسومات اور پوجا پاٹ کا شیریں تتمّہ ہوا کرتا۔

سکھوں کو مسلمان درویشوں سے بہت عقیدت تھی۔ خود گورو نانک دیوجی کو بھی حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے فیضان پہنچا تھا۔

سکھوں نے اپنے عہد میں جو عمارتیں بنوائیں ان میں رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ اب بھی شہر کے اندر اور گرد و نواح میں چھوٹی اینٹ کے تعمیر کردہ جو مکانات موجود ہیں وہ سکھوں کے عہد کی یاد دلاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے چھوٹی اینٹ کا استعمال پنجاب بھر میں کہیں نہیں تھا۔ اسی لئے اس اینٹ کو رنجیت شاہی اینٹ کہا جاتا ہے۔

تحریک مجاہدین

سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین میں پوٹھوہار کے گکھڑ سرداروں کے تعاون کا جزوی حوالہ تو تذکروں میں ملتا ہے مگر تفصیل دستیاب نہیں۔

سید شہیدؒ نے ۱۸۲۲ء اور ۱۸۲۵ء کے درمیانی وقفہ میں جو خطوط والیانِ ریاست کے نام لکھے تھے ان میں سے ایک خط پوٹھوہار کے گکھڑ رئیس راجہ جہانداد خان کے نام کا بھی ملتا ہے۔ اس سے پہلے شاہ اسمٰعیل شہید جب سکھوں کے مظالم کی رُوداد مرتب کرنے کے لئے دہلی سے عازم پنجاب ہوئے تو وہ قلندروں کے بھیس میں ریچھ نچاتے ہوئے پوٹھوہار سے گذر کر پشاور تک گئے تھے۔

وقت وہ تھا کہ گکھڑوں کے اقتدار کا سورج ڈھل چکا تھا کیونکہ انیسویں صدی کے اوائل میں پنجاب کے اندر سکھا شاہی کا دور شروع ہوتے ہی خوف و ہراس کی عام فضا طاری ہوگئی تھی اور گکھڑوں کے سر کی قیمت سکھوں نے ایک روپیہ مقرر کر دی تھی لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ سراسر راکھ ہونے کے باوجود گکھڑوں کی حرارتِ ایمانی کم نہ ہوئی تھی۔

سید احمد شہید نے جو خطوط دردمند رؤسا کے نام لکھے تھے۔ راجہ جہانداد گکھڑ کے نام کا خط بھی انہی میں شامل ہے۔ جیسا کہ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے عوام کو دعوتِ جہاد بذریعہ وعظ اور زعما کو بذریعہ خطوط دی گئی تھی۔

جنوری ۱۸۲۵ء میں سات ہزار مجاہدین کا لشکر سید احمد شہید کی قیادت میں دہلی سے روانہ

ہوا تھا۔ سید صاحب نے سکھوں کے ساتھ جہاد کے لئے ۲۱ر دسمبر ۱۸۲۶ء کا دن بھی متعین کر دیا تھا۔
یہ لشکر بہاول پور حیدر آباد سندھ شکار پور اور درہ بولان سے ہوتا ہوا کابل پہنچا اور وہاں چند دن
قیام کے بعد خیبر کی راہ سے دریائے کابل کے کنارے نوشہرہ میں پڑاؤ کیا۔ یہیں اکوڑہ خٹک کے قریب
پروگرام کے عین مطابق ۲۱ر دسمبر ۱۸۲۶ء کو معرکہ ٔ یک شب ہوا جس میں سکھوں کو بھاری جانی نقصان
اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ اس کے بعد اکا دکا جھڑپیں ہوتی رہیں۔ مجاہدین کو سامانِ رسد کی بروقت فراہمی
نہ ہونے کے باعث کئی ہفتے سخت مشکلات کا سامنا رہا۔ وہ مسلسل درختوں کے پتے ابال ابال کر کھاتے
رہے۔ اس کے بعد مختلف اضلاع سے غازیوں کو مزید کمک اور روپیہ پہنچ گیا۔ سکھوں کے ساتھ ایک
بڑی جنگ کی تیاری شروع ہو گئی ــــ یہی وہ مرحلہ ہے جب گکھڑوں کا بھی ایک دستہ جہاد میں شرکت
کی خاطر اکوڑہ خٹک پہنچا۔

گکھڑوں کے علاوہ پوٹھوہار کے نامور درویش کامل حضرت حافظ محمد عبداللہ دیوان حضوری گدی نشین کی اولاد اور بے شمار متوسلین نے بھی "تحریکِ مجاہدین" میں بھرپور حصہ لیا۔ تحریک کی ناکامی کے بعد
راجہ رنجیت سنگھ خود رہتاس آیا اور "بشن دور" پر باضابطہ حملہ کا پروگرام بنایا مگر ارادہ کو
عملی جامہ پہنائے بغیر واپس چلا گیا تاہم درگاہِ بشن دور کے متوسلین اور صاحب سجادہ کے افرادِ
خاندان کو "شرکتِ جہاد" کے بعد بڑی جانکاہ مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ نے
پکڑ دھکڑ کا بازار گرم کیا اور بشن دور کے خاندانِ عالیہ کے دو بزرگوں کو پکڑ کر رہتاس کے قلعہ میں
لے گیا جہاں سہیل گیٹ کے اندر انہیں شہید کر دیا ان کے جنازوں کو اندر کوٹ لے جا کر بے گور و کفن
سپرد خاک کر دیا۔ ان کے عزیز و اقارب پر طرح طرح کے ستم ڈھائے ان کے گھر لوٹ لئے اور آستانہ
عالیہ بشن دور کا مایہ ناز کتب خانہ تباہ کر دیا۔

ادھر بالاکوٹ میں ۶ر مئی ۱۸۳۱ء کو جب مجاہدوں کو شکست ہوئی تو ان کی بچی کھچی جمعیت
علاقہ غیر میں "ستھانہ" چلی گئی اور یہ مقام تحریک مجاہدین کے دوسرے مگر طویل دور کا ایک کیمپ قرار

پایا ۔

سن ستاون (۱۸۵۷ء) کی جنگ آزادی کے بعد اس کیمپ میں میرٹھ اور دہلی کے بھی بہت سے جانباز آ گئے اور انگریزوں کو ان سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔

۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۲ء کے درمیان تحریک مجاہدین کے امدادی مرکزوں سے وابستہ افراد کو انگریزوں نے سیاسی مقدموں میں لپیٹ لیا اور بہت سے جاگیرداروں اور امین داروں کی جائدادیں بحقِ مملکت ضبط کر لیں۔

قبائلی علاقہ میں ۱۸۵۸ء کے بعد مہمند آفریدی اور مسعودی قبائل کے ساتھ انگریزوں کی جو جھڑپیں ہوئیں ان کا تمام تر الزام بھی مجاہدین پر لگایا گیا۔ اور یہ الزام حقیقت سے خالی نہیں تھا۔

ہندوستان بھر میں تحریک سے دلچسپی رکھنے والوں پر کڑی نگرانی شروع ہو گئی۔ ادنیٰ سے شبہ کی بنا پر قید اور جرمانہ ہی نہیں، پھانسی یا عبور دریائے شور کی سزائیں دی جانے لگیں لیکن تحریک کے معاونین بڑی رازداری اور پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا کام کئے جاتے۔ ستھانہ سے مجاہدوں کے نمائندے بھیس بدل بدل کر آتے اور اندرونِ ملک گھوم پھر کر اپنے امدادی فنڈ کا روپیہ اور دوسرا ساز و سامان لے کر واپس چلے جاتے۔

شوقِ جہاد میں بنگال تک سے حرب و ضرب کی تربیت حاصل کرنے والے رضا کار بھی آتے جاتے۔ ظاہر ہے کہ ان رضا کاروں کو سرِ راہِ ستھانہ پوٹھوہار کے کسی دیہات یا راولپنڈی میں تحریک کے خفیہ ٹھکانوں کا علم ہوگا اور وہ یہاں دم لے کر آگے روانہ ہوتے ہوں گے۔ میں بڑی تگ و دو کے باوصف ان خفیہ ٹھکانوں کا پتہ نہیں چلا سکا۔

دسمبر ۱۸۶۳ء میں تحریک کے نامور مجاہد مولوی جعفر تھانیسری پر جو مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں راولپنڈی سے محمد شفیع اور شیخ الٰہی بخش کو بھی گرفتار کر کے انبالہ لے جایا گیا۔ یہ دونوں متمول ٹھیکیدار تھے جو افواجِ برطانیہ کو گوشت سپلائی کرنے کا دھندا کرتے تھے۔ مجاہدین کو مالی

امداد پہنچانے اور بغاوت کے جرم میں حصہ لینے کی وجہ سے انہیں دھر لیا گیا لیکن ان دونوں نے وعدہ معاف گواہ بن کر جان بچالی۔

جیسا کہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے بھی لکھا ہے۔ ۱۹ ویں صدی عیسوی کے رُبع آخر میں تحریک مجاہدین کا امدادی فنڈ راولپنڈی میں شیخ نبی بخش اینڈ سنز کے پاس جمع ہوا کرتا تھا۔ میرے دادا مولانا ہدایت اللہ مرحوم کے شیخ صاحب سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ "ستھانہ" سے تحریک کے نمائندے میرے دادا مرحوم ہی کے پاس آتے اور انہی کی وساطت سے اپنا چندہ وصول کیا کرتے تھے ۔۔۔۔ مگر میں اس بحی داستان کا الگ باب اپنی "سرگذشت نشیمن" میں درج کروں گا۔

وقت تیزی کے ساتھ گزر گیا۔ پوٹھوہار کی خاک پر ان مجاہدوں کے قدموں کے نشان اب بھی موجود ہوں گے جنہوں نے نتائج سے بے خوف ہو کر پہلے سکھوں اور پھر تاج برطانیہ سے ٹکر لی۔ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور دنیا ان کے کارناموں کو بھی بھولتی جاتی ہے اور یہ فقیر ان کی کہانی پُرنم آنکھوں سے رقم کر رہا ہے۔

سن ستاون کی جنگ آزادی

انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف پنجاب اور بالخصوص پوٹھوہار میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران جس کردار کا مظاہرہ ہوا تھا کتابوں میں اس کا مختصر حال ہی ملتا ہے تاہم کسی بھی پیمانے پر ہو حریتِ آزادی کی شمع نے اپنی روشنی پھیلانے میں کسر نہیں چھوڑی۔ اس روشنی کی کرنیں راولپنڈی اور جہلم کے علاوہ کوہ مری میں بھی پھوٹیں۔

۱۸۵۱ء میں کوہ مری نارورن کمانڈ کی برطانوی افواج کا گرمائی مستقر قرار پایا تھا مگر ابتداءً یہ ٹھکانہ تریٹ سے کچھ اوپر نندکوٹ میں بنایا گیا۔ سنتے ہیں وہاں لوگوں نے انگریز فوجیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔

نندکوٹ میں ان دنوں ایک سائیں صدقی رہتا تھا۔ وہ کشمیر کا رہنے والا تھا۔ طبیعت کا جلالی اور مغلوب الحال مجذوب تھا۔ اس نے ایک انگریز افسر سے کہا: "صاحب بہادر تم لوگ یہاں سے بوریا بستر باندھ کر کہیں اور ٹھکانہ کرو۔ ورنہ انجام ٹھیک نہیں ہوگا۔" اس بات کو مجذوب کی بڑ سمجھا گیا۔ چند ہی روز بعد کیمپ پہ ہیضہ پھوٹ پڑا اور ساتھ ہی بے شمار سانپ بھی رینگنے لگے جن کے ڈسنے سے لاتعداد گورے موت کی آغوشش میں چلے گئے۔ مرگِ انبوہ کے اس جشن میں بیکھنڈ کر سدھارنے والے انگریزوں کی اَن گنت قبریں نندکوٹ میں موجود ہیں۔

بالآخر انگریزوں کو وہاں سے کیمپ اٹھانا پڑا اور اسی پہاڑ میں کچھ آگے جا کر اس جگہ کا انتخاب

کیا جہاں آج کل مری کی سبز پوش بستی ہے۔

اس زمانے میں یہاں گھنیرا جنگل تھا جو مسیاڑی والوں کی ملکیت تھا۔ انگریزوں نے ان سے ساٹھ روپے سالانہ پٹہ پر چند کنال زمین خریدی۔ قدم جمائے اور پورے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ درخت کٹتے گئے، بنگلے بنتے چلے گئے، آبادی بڑھتی رہی اور اہلِ مری کے غم و غصہ میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

مئی ۱۸۵۷ء میں جب میرٹھ سے جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تو اس کی بازگشت ہر طرف سنی جانے لگی۔ پنجاب میں لدھیانہ، جالندھر، ہوشیارپور، امرتسر، لاہور، اور سیالکوٹ سے اس آگ کے شعلے راولپنڈی تک آپہنچے۔ انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی جہلم میں جو دیسی سپاہی تھے وہ بھی بگڑ گئے۔

راولپنڈی کے تین حریت پسند، بیدار مغز افراد نے جنگِ آزادی کے شعلے بھڑکانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک ان میں سے سید کرم علی تھا جو قلعی گر کا بھیس بنا کر مری اور جہلم جاتا اور زمین ہموار کر کے واپس آتا۔ ڈاکٹر رسول بخش اور ڈاکٹر امیر علی اس کے رفیق کار تھے۔ خفیہ پولیس ان کا پیچھا کر رہی تھی اور ہر جگہ حفاظتی تدابیر کام میں لائی گئی تھیں۔

مری میں متعین پلٹنوں کے اندر شاید ہی کوئی دیسی سپاہی ہو اس لئے وہاں حفاظتی انتظامات کی ضرورت نہ تھی ـــ مگر کوہسارِ مری کی زخم خوردہ سول آبادی نے ہتھیار اٹھا لئے۔ ۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کی رات مری کی سرسبز وادی آزادی کے بھبھ شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ کھنی طاق گاؤں کی ایک بڑھیا نے جس کا نام مُتّا تھا۔ کسی فوجی افسر کو بروقت خبر کر دی کہ ان پر حملہ ہونے والا ہے اس لئے فوری طور پر کچھ انتظامات کر لئے گئے

ہزارہ کے قبیلہ کڑال نے بھی تین سو مجاہدوں کا دستہ مسلح کیا اور مری کی طرف آ گئے۔ دفترِ خزانہ کو لوٹا اور کمشنر بہادر کے بنگلے کو آگ لگا دی، لیکن جونہی مال روڈ کی طرف آئے گھات میں بیٹھے ہوئے

فوجیوں نے فائر کھول دیا۔ بہت سے مجاہد شہید ہو گئے ان کا قائد رحمت خان اور اس کے چند سرکردہ ساتھیوں کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا۔ پھر ایک صبح فٹ بال گراؤنڈ میں ان سب کو ترپ دم کر دیا گیا۔

۷ر جولائی ۱۸۵۷ء کو جہلم کی یونٹوں سے اڑھائی سو سپاہی اسلحہ سمیت بھاگے اور جموں جا پہنچے۔ کچھ مارے گئے کچھ گرفتار ہوئے اور ان کو پھانسی دے دی گئی۔

راولپنڈی کی دو دیسی رجمنٹوں سے ۲۶ جوان مع اسلحہ بھاگ نکلے مگر تعاقب کے دوران کچھ مارے گئے اور کچھ کو گرفتار کر کے واپس لایا گیا۔

فی الجملہ ۳۴۵ سپاہیوں پر فوجی اور سول عدالتوں میں مقدمات چلائے گئے اور سزائیں دی گئیں۔

اس دوران خفیہ اطلاعات کی بنیاد پر سید کرم علی، رسول بخش اور امیر علی بھی گرفتار کر لئے گئے ان پر الزام رہا کہ وہ جلسوں سے خطاب کرتے اور لوگوں کو بغاوت پر اکساتے ہیں۔

سید کرم علی کو ۱۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء کی رات پھانسی دے دی گئی۔ ڈاکٹر رسول بخش اور ڈاکٹر امیر علی کو ۷ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

قدیم مذہب اور لوک روایت

مختلف زمانوں کے اعتبار سے برصغیر میں چھ دور گذرے۔

۱. ویدک دور۔

۲. برہمنی دور۔

۳. بدھ مت۔

۴. برہمنیت کی تجدید۔

۵. اسلامی دور۔

۶. عہد فرنگی۔

ویدوں کا زمانہ تین ہزار برس پہلے کا ہے جب آریاؤں کے قدم اس سرزمین پر آئے اور یہ دور تاریخ ہند کی ان روائیتوں کا دور ہے جو مذہبی کتابوں سے اخذ کی گئی تھیں اور یہ کتابیں وید کہلاتی ہیں۔ جن کی تعداد چار ہے۔ سام وید۔ یجر وید۔ اتھر وید۔ اور رگ وید۔ ان میں سے رگ وید پوٹھوہار کے علاقہ میں بہت مقبول تھا اور اسے قدیم تاریخ کا ماخذ بھی سمجھا جاتا ہے۔

برہمنوں کی پوترتا کا آغاز ۱۰۰۰ ق م میں ہوا۔ یہ عقیدہ پوجا پاٹ کے مخفی بھید عبارت

کی روح اور نیست و ہست کے نظریہ سے اخذ کیا گیا۔ اس نظریہ کی بنیاد روحِ واحد یا روح کائنات کے تصور پر قائم ہوئی اور آگے چل کر اسی کی کوکھ سے وہ دیوتائی تصور ابھرا جس کو برہما یعنی اصلِ کائنات کا نام دیا گیا اور برہمنوں کو مقدس ترین مقام حاصل ہو گیا۔ وہ زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئے تاہم حکمران طبقہ کی ہمہ مقتدر مطلق العنانی کو برہمنوں سے کچھ زیادہ ضعف نہیں پہنچا۔ نیز یہ بھی کہ برہمنی نظام کو پورے ملک میں نہیں اپنایا گیا کیونکہ بعض حصوں میں پرانے طریقے اور رسوم و رواج بدستور موجود رہے۔ تاہم جہاں جہاں برہمنیت کا غلبہ رہا۔ وہاں وہاں ذات پات کے بکھیڑے شروع ہو گئے لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ برہمنی دور میں علم و ادب کو ترقی ہوئی اور بڑے بڑے علمی مرکز کھل گئے۔

برہمنی اقتدار چند صدیوں تک جہاں تہاں رہا پھر چھٹی صدی ق م میں گوتم بدھ نے برہمنیت کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ مگر اس کے باوصف برہمنوں کا وجود اور ان کی دیو مالائی روائتوں کا سنگھاسن پوری طرح ڈول نہ سکا۔ ۹۴۳ء میں جب بدھ مت کا زوال شروع ہوا تو برہمنوں کو از سر نو عروج حاصل ہوا۔ ستی کی رسم۔ وشنو بھوجن جیو ہتھیا۔ اھنسو پرمو دھرما اور خاص طور پر اُتم جاتی کا نکھد جاتی والوں کے ساتھ رشتے ناطے نہ کرنا برہمنی تعلیمات ہی کا نتیجہ ہے۔

یونانی سفیر میگستھینز نے لکھا ہے "ہندو اور یونانی فلسفہ میں ایک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے اور دونوں کی تعلیمات میں ہم آہنگی نظر آتی ہے مثلاً یہ کہ دنیا کا ایک آغاز اور معیّن انجام ہے۔ اور افلاطون کی طرح ہندوستانی کہانیوں کی بُنت میں بھی روح کے غیر فانی ہونے اور اس دنیا کے بعد آنے والے عالم میں اعمال کی جزا و سزا کا تصوّر ملتا ہے۔

مسلمانوں کی آمد کے بعد خطۂ پوٹھوہار ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ یہ دور ذہنی اور اخلاقی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ سورج پرستی، آتش پرستی۔ جین مت اور بدھ مت، ہندو

دھرم یا برہمنی روو بیت گیا اور اسلام پوٹھوہار کے دور افتادہ دیہات تک پھیل گیا اولیائے کرام کی تبلیغی مساعی سے اسلامی روایات کی عملداری قائم ہوگئی۔

معاشرت

پوٹھوہار پر سکندر اعظم کے حملے سے کوئی فوجی یا سیاسی نتیجہ نکلا ہو یا نہ نکلا ہو ایک فائدہ بہرحال یہ ہوا کہ سکندر کے پرچہ نویسوں نے اپنے تاثرات قلمبند کر دیئے جن سے اُس دور کی معاشرت کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم ہوگئیں۔

جگاٹی گیرٹ (G.T. GARROT) کے مطابق "سکندر اعظم کے لشکر میں تربیت یافتہ مورخین" اور ماہر طبیعیات بھی تھے اور ٹیکسلا کا علمی اور تہذیبی مرکز بطور خاص ان کی توجہ کا محور رہا کیونکہ برصغیر کے حکمران خاندانوں کے راجکمار اور برہمن زادے یہاں وید وں اور دوسرے علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جمع تھے۔"

یونانی پرچہ نویس لکھتے ہیں کہ خطہ پوٹھوہار میں غیر آریائی تہذیب کے نقوش نمایاں تھے اور باہر سے وارد ہونے والے حملہ آوروں اور تاجروں کی وجہ سے اہل پوٹھوہار کا رہن سہن متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ اور بات ہے کہ برہمن طبقہ اجنبیوں کو ہمیشہ "ملیچھ" ہی سمجھتا رہا۔

سکندر کا امیرالبحر نارکوس یہاں کے لوگوں کے لباس کے بارے میں لکھتا ہے کہ "لوگ سوتی کپڑے پہنتے ہیں۔ یا تو اس علاقہ کی کپاس کا رنگ ہی نمایاں طور پر سفید ہے یا پھر لوگوں کے اپنے رنگ اتنے کالے ہیں کہ ان کے بدن پر کپڑے زیادہ اُجلے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لوگ سوتی زیرجامہ پہنتے ہیں جو گھٹنے سے ذرا نیچے یا ٹخنوں تک ہوتا ہے۔ دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لئے چھتری کا استعمال کرتے ہیں۔ سفید چمڑے کے جوتے پہنتے ھیں۔ جن کی تیاری میں خاصہ اہتمام نظر آتا ہے۔ ان جوتوں کے تلے بہت دبیز ہوتے ہیں۔"

سکندر کے حملہ کی وجہ سے افغانستان اور ایران کے ساتھ کئی تجارتی شاہراہیں کھل گئیں۔ آگے چل کر تجارتی آسودگی نے شہروں کے پھیلاؤ میں نمایاں حصہ لیا۔ مختلف ہنرمندوں نے بود و باش کے لئے شہروں میں اپنے لئے مختلف علاقے مخصوص کر لئے۔ پیشے ذیلی ذاتوں میں ڈھل گئے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ بیٹے اپنے باپ کے پیشے کو اختیار کر کے اہلِ ہنر کے پشتینی اصول کو اپنا لیتے۔

سٹرابو (STRABO) نے ٹیکسلا میں رائج ایک قبیح رسم کا ذکر کیا ہے کہ یہاں ایک منڈی تھی جہاں مفلس والدین اپنی جوان لڑکیوں کو نیلام کی بولی پر چڑھانے کی خاطر لاتے اور گاہکوں کے ذوقِ نظر اور شوقِ جمال کے لئے ان بے زبان لڑکیوں کے بدن لباس کے تکلفات سے مبرّا کر دیئے جاتے تھے۔

یونانیوں کا کہنا ہے کہ یہ علاقہ خاصہ خوشحال گنجان آباد اور پُرامن تھا۔ لوگ سادہ مگر مالی اعتبار سے آسودہ تھے۔ زمینیں اگرچہ سرکاری تسلط میں رہیں تاہم کاشتکاروں پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔ قحط شاذونادر ہی بپا ہوتے۔ تعدادِ ازدواج اور ستی کی رسم موجود تھی بعض مُردوں کی لاشیں کرگسوں کا لقمہ بنانے کے لئے باہر پھینک دی جاتیں از زرتشت مذہب والے آتش پرست ایسا کرتے ہوں گے۔ ٹیکسلا میں ان آتش پرستوں کا ایک مندر موجود ہے) ضیافتوں میں گوشت کھایا اور کھلایا جاتا تھا۔ لیکن برہمنوں کا خیال ہے کہ یہ تمام رسوم باہر سے آکر ٹیکسلا میں آباد ہونے والے لوگوں کی تھیں۔ ویسے ٹیکسلا کے قدیم باشندے برہمنی مذہب کے پیرو تھے۔

علاقہ بھر میں اشوک سے لے کر کنشک تک مہاتما بدھ کے بت پوجے جاتے اور بدھ مت کی بے تحاشہ خانقاہیں اور مندر تعمیر ہوئے۔ کنشک نے یونانی بت سازوں اور سنگ تراشوں کو پشاور بلوا لیا تھا ان کی آمد سے صنعتِ آذری کو فروغ ہوا۔ اور گندھارا سکول آف آرٹ

نے جنم لیا۔ سردی کے ایام میں کنشک پشاور چلا جاتا۔ پشاور کا علاقہ ان دنوں گندھارا کہلاتا تھا۔ اور اس کی حدیں راولپنڈی تک تھیں۔

ایرین (ARRIAN) لکھتا ہے ۔"یونانیوں نے پوٹھوہار کے لوگوں کو دراز قامت اور نازک اندام پایا۔ لوگوں کی عمریں دراز اور امراض کم ہیں۔ اس کی وجہ سادہ غذا اور شراب سے اجتناب ہے لوگ دیانت دار ہیں۔ یہاں تک کہ امانتوں پر کسی کو گواہ نہیں ٹھہراتے۔ لین دین باہمی اعتماد پر چلتا ہے۔ گھروں پر محافظوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے قانون کا انحصار کتابوں پر نہیں ہے بلکہ قانون کو رواج اور ریت کا تابع بنا دیا گیا ہے۔

عسکری روایات

صدیوں کی پیاپے کروٹوں اور ماہ و سال کی گردان میں پشتینی شمشیر گیروں کا جاہ و جلال اور زالی آن بان شان رکھنے والوں کا اقتدار اگرچہ خاک میں مل گیا۔ تاہم ان کے تیغ آزما کردار کی جھلک ان کے تیور سے اب بھی نمایاں ہے۔

پوٹھوہار کا ماضی حرب و ضرب کی شاندار روایات کا مظہر ہے اتفاق ہے کہ یہ خطہ زمانۂ قدیم سے حملہ آوروں کی گذرگاہ رہا ہے اور اسے بڑی بڑی یورشوں کا سامنا کرنا پڑا ہے جن کے اثرات نے اہلِ پوٹھوہار کے کردار پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ انہیں اپنی مدافعت کے لیئے ہر آن مستعد اور چوکس رہنے کی ضرورت رہی۔ یونانی سفیر میگستھینز لکھتا ہے کہ ــــ "ملک بھر میں متعدد قبیلے آباد ہیں۔ ان میں سے بعض اتنے طاقت ور ہیں کہ ان کی اپنی باضابطہ فوج بھی موجود ہے ــــ"

اس رائے کا اطلاق سب سے زیادہ گکھڑوں پر ہوتا ہے کہ ان کی اپنی باضابطہ فوج اور کئی ایک چھوٹے بڑے قلعے بھی موجود تھے۔ ان قلعوں کے کھنڈر آج بھی گکھڑوں کی عسکری روایات اور عظمت کے آئینہ دار نظر آتے ہیں۔ ان کے زمانے کے تیر تفنگ، ڈھالیں اور دیگر آلات لاہور کے عجائب گھر اور پھروالہ خاندان کے ظہور اختر کے پاس موجود ہیں۔

ایک صدی پہلے کی بات ہے لبال گاؤں کا ایک نوجوان اپنے ارادوں کی تکمیل کا کوئی راستہ نہ پاکر روس چلا گیا۔ وہاں اس نے فوج میں ملازمت کر لی اور ترقی کرتے کرتے جرنل کے عہدے پر فائز ہوا

وہیں مرا اور دفن ہوا۔

برطانوی عہد اور اب عساکرِ پاکستان میں اہلِ پوٹھوہار کے جری اور جیالے سپاہیوں کا نمایاں کردار سب کے سامنے ہے۔ آگ اگلنے والے ٹینکوں کے منہ میں کود کر حیاتِ جاوداں کا سراغ پانے والوں کے جذبۂ حریت کو ایک زمانہ سلام کہتا ہے۔ دشمن نے سمجھ رکھا تھا کہ پاکستان کو لقمۂ تر کی طرح نگل لیں گے مگر پاکستان کے غازیوں کی ہمت جانی نے انہیں مشکل لمحات میں فتح مبیں عطا کی اور ایشیا کا ہیرو بنا دیا۔ نشانِ حیدر کا اعزاز پانے والا سب سے پہلا فوجی افسر سرور شہید گوجرخان کے موضع "سنگوری" کا رہنے والا تھا اور یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ اس عظیم اعزاز کا حقدار سپاہی محمد حسین شہید بھی تحصیل گوجرخان کے "موہڑہ حیات" کا رہنے والا تھا۔

راولپنڈی صدر میں جنرل پوسٹ آفس سے مریڑ حسن کے پل تک جو سڑک جاتی ہے اُسے انگریزی عہد میں ڈلہوزی روڈ کہا جاتا تھا پاکستان بننے کے بعد کشمیر روڈ کہلائی اور اب محمد حسین روڈ کے نام سے موسوم ہے۔

قلعۂ رہتاس کے باب میں پہلے لکھا جا چکا ہے کہ شیر شاہ سوری نے گکھڑوں کے پاس اپنا ایلچی بھیج کر صلح کا ہاتھ بڑھایا تھا مگر گکھڑوں نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ شیر شاہ نے ان سے نبرد آزما ہو کر ان کی عسکری قوت کا اندازہ لگانے کے بعد ہی قلعہ رہتاس کی تعمیر شروع کرائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ گکھڑوں کو بزورِ شمشیر رام کرنا قرینِ مصلحت ہے اور اس کا آغاز ایک مضبوط قلعہ سے ہونا چاہیے جہاں افغان فوج بھاری تعداد میں موجود رہے اور گکھڑوں سے نمٹتی رہے۔ لیکن قلعہ ضرور تعمیر ہو گیا۔ فوج بھی متعین ہو گئی مگر گکھڑوں سے تو کیا نمٹا جاتا۔ خود شیر شاہ کے جانشینوں کو جان کے لالے پڑ گئے۔

سکھوں نے اپنے عہد کے آغاز میں گکھڑوں کے سر کی قیمت ایک روپیہ مقرر کی تھی۔ ایک روپیہ اس زمانے میں بڑی شے تھا اور اسی سے گکھڑوں کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان دنوں جب

وہ آپس میں بھی اُلجھے ہوئے تھے اور ان کی اجتماعی قوت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ سکھ ان کے ایک ایک فرد کو چن چن کر ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ سکھوں کا خوف اپنی جگہ بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ یہ لوگ اگر کبھی متحد ہو گئے تو واہ گورو جی کے خالصوں کی خیر نہیں۔ ویسے ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مل کر انہوں نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ چنانچہ سکھوں نے گکھڑوں کو سیاسی ہی نہیں پیٹ کی مار بھی دی۔ یہ معاشی اضطراب جو نصف صدی کو محیط رہا اس حد تک کرب انگیز صورت اختیار کر گیا کہ سکھا شاہی کے خاتمہ پر برطانوی عہد میں پوٹھوہار کے لوگ بھاری تعداد میں بھرتی کے لئے نکلے اور انہوں نے ہر میدان میں اپنی عسکری صلاحیتوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

علاقے گاؤں اور رسم ورواج

راولپنڈی

راولپنڈی — پوٹھوہار اور پہاڑی علاقے کا درمیانی واسطہ ہے — پنڈی کا شہر نالہ لئی کے اِدھر اُدھر اور ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا ہے۔ یہ نالہ نواحی کوہسار سے رینگتا ہوا اور شاہی پھروں کی یلغار اور مارا مار کا نغمۂ نوبہار سنتا سناتا ہوائے مرغزار کے دوش پر غلاظت سے اَٹی ہوئی بُو کے مشکبار کے بھبکے اڑاتا آبادی کے بیچوں بیچ گزرتا ہے۔

چاروں کھونٹ پھیلتی ہوئی آبادی تو بہت بعد کی بات ہے جہاں ان دنوں پختہ مکانات اور سڑکوں کے سلسلے پھیلے پڑے ہیں وہاں ماضی قریب تک دیہات کے کچے گھروندے اور زرعی زمینیں تھیں — دیہات شہر میں نہیں بدلے۔ شہر نے بازو پھیلا کر خود ان کو آغوش میں لپیٹ لیا۔

دھیرے دھیرے سنگ و آہن کی تعمیروں نے زرعی زمینوں کی ہریالی اڑالی اور ماحول کی سادہ و کش رو فضا کو دھوئیں کا غبار بنا دیا۔ اب لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے اس پار پیپل کے پیڑ تلے کنوئیں کے گرداگرد گھومنے والے بیلوں کے گلے میں بجنے والی گھنٹیوں کی سریلی تانوں اور رہٹ کی رُوں رُوں کے بجائے کسی گھر کے آنگن سے ریڈیائی لہروں پر ابھرنے والے گیتوں ہی کے بول سنائی دیتے ہیں۔

مکانوں کے ساتھ ساتھ مکین بھی بدل گئے۔ پشتینی کاشت کاروں نے باعزت روزگار کے نئے نئے وسیلے اختیار کر لئے اور اب بدلتی قدروں کا کرشمہ ہے کہ ؎

"اینٹیں تھاپتے پھرتے ہیں "ہل واہے"

ایک پنڈی شہر ہی نہیں پورا خطہ "پوٹھوہار" ان گنت اور بے شمار چھوٹے بڑے دیہات پر مشتمل

ہے۔ یہ وہ دیہات ہیں جن کی شکل وصورت شہر کی سی ہو گئی مگر ان میں دیہاتیت ابھی تک باقی ہے یعنی
باوجودِ خزاں بوئے یاسمن باقی ست۔

دیکھتے دیکھتے جو دیہات کنٹونمنٹ کا حصہ بن گئے ان میں ٹینچ بھاٹہ آوڑہ، مریڑ حسن، جھنڈا چیچی
چوہڑ ہرپال، سہام، موہری غزن، ٹکھڑ (موجودہ مغل آباد) ٹلسہ، موضع ترپئی جاورہ (موجودہ بکرا
منڈی) وغیرہ شامل ہیں۔

ان میں مریڑ حسن اور ٹینچ بھاٹہ دو ایسے گاؤں تھے جن کی رہائشی آبادی چنداں وسیع نہیں تھی
مگر ان کی زرعی زمینوں کا رقبہ خاصہ تھا۔ مریڑ حسن والوں کے کھیت ایک جانب میکسن روڈ سے آریہ
محلہ اور دوسری جانب ڈھوک کھبہ سے چک لالہ تک پھیلے ہوئے تھے۔
اسی طرح لال کڑتی ڈھیری حسن آباد اور ٹاہلی موہری کی زمینیں ٹینچ بھاٹہ والوں کی تھیں۔ شیر شاہ کی
شاہراہ اعظم ٹینچ بھاٹہ کے برابر سے ٹاہلی موہری ہوتی ہوئی گذرتی۔ ان دنوں ٹاہلی موہری میں آبادی
نہیں تھی بلکہ محض زرعی زمینیں تھیں۔ شیشم کے پیڑوں کا گھنا جنگل کھڑا تھا۔ یہاں قدیم شاہراہ اعظم کا
تھوڑا سا کچا ٹکڑا ابھی موجود ہے جس کے دائیں بائیں شیشم کے درخت ہیں اور بکرا منڈی کی جانب سے
ٹاہلی موہری کے راستے میں اسی سڑک پر کڑی کا بنا ہوا ایک پرانا پل بھی موجود ہے۔ پل اتنا پختہ ہے
کہ دھمیال کی طرف جانے والی بھاری فوجی گاڑیاں اس پر سے بآسانی گذر جاتی ہیں۔ ڈھوک سیداں
سے بکرا منڈی کی طرف آنے والی شاہراہ اعظم کے کچے ٹکڑے کو اب پختہ کرا دیا گیا ہے مگر بکرا منڈی سے
آگے کچے راستہ کے نشانات باقی ہیں یہی راستہ رہتاس کے قلعہ تک چلا گیا تھا۔

ٹینچ بھاٹہ کے قدیمی رہنے والوں میں غالب تعداد آوڑہ اور چوہان راجپوتوں کی ہے اور ٹاہلی موہری
کے گاؤں میں جو اصلاً ٹینچ بھاٹہ ہی کا حصہ ہے، بیشتر قریشی دو لال رہتے ہیں۔ کسی قدر جستجو کے بعد مجھے
صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ سکھا شاہی کے ابتدائی دور (۱۷۶۵) میں چند قریشی خاندان ان کے ظلم وستم
سے تنگ آ کر ادھر ہجرت کر آئے اور انہوں نے ٹینچ بھاٹہ والوں کی اجازت سے ٹاہلی جنگل کے ایک

حصہ کو ناصل درختوں سے صاف کر کے یہ گاؤں آباد کر لیا۔ ویسے دھمیال میں بھی دو لال قریشی موجود ہیں

تیسرا بڑا گاؤں رتہ امرال کا ہے جس کی زرعی زمینیں تین میل کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ اُدھر ریلوے سٹیشن سے ملٹری ہسپتال تک اِدھر ریس کورس گراؤنڈ سے ویسٹریج تک انہی کے کھیت لہلہایا کرتے۔ البتہ موجودہ ویسٹریج کا نصف مغربی حصہ چوہڑ ہرپال والوں کا تھا۔

کنٹونمنٹ ہی میں موضع کوٹھا کلاں کا کچھ حصہ شامل ہے اس میں راجپوت ستسرال آباد ہیں۔ کوٹھا کلاں سے ملحق مورگاہ ہے جہاں اٹک آئل کمپنی ہے۔ مورگاہ میں گوجر قوم آباد ہے۔ اسی طرح موضع چک لالہ میں بھی بیشتر گوجر ہی آباد ہیں۔ ہوائی اڈہ بھی اسی جگہ ہے۔ اڈے کے عقب میں ملیاروں کا ایک بہت بڑا گنگال گاؤں ہے جس کی زرعی زمینوں کی زرخیزی کا علاقہ بھر میں جواب نہیں۔

پنڈی کے وہ دیہات جواب شہری آبادی کا حصہ ہیں ان میں پیرودھائی، ڈھوک منگال، ڈھوک ولیس راج، پنڈورہ اور سیٹلائٹ ٹاؤن کا وسیع رقبہ، ڈھوک حسو اور ڈھوک حیات وغیرہ ہیں۔ چاہ سلطان پرانے موضع ٹاہلیاں کا جدید نام ہے۔ زراعتی فارم کے آس پاس کی آبادی، صادق آباد، کھنہ ڈاک، کھنہ کاک وغیرہ بھی قدیم گاؤں ہیں مگر راولپنڈی جس اصل قصبہ کا نام تھا۔ وہ قلعہ بنڈراول کے اندر تھی۔ اسی قلعہ کو آج کل پرانا قلعہ بھی کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ گوالمنڈی، نیا محلہ، محلہ ورکشاپی، راجہ بازار باغ سرداراں، محلہ شاہ چن چراغ، محلہ وارث خان، بنی تالاب، محلہ امام باڑہ، ڈھوک کھبہ وغیرہ آبادیاں بنتی چلی گئیں۔

جہانگیر تزک (جلد اول صفحہ ۱۹۷) میں لکھتا ہے ــ

ــ "۹ خرم ۱۰۱۶ ہجری (مطابق ۱۶۰۷ء) کو راولپنڈی سے آگے اترا۔ اس موضع کو راول نامی ایک ہندو نے آباد کیا تھا۔ پنڈی گکھڑوں کی زبان میں گاؤں کو کہتے ہیں ــــ اس منزل سے آگے درے کے درمیان ندی تھی (نالہ کورنگ) اس ندی کا پانی آگے ایک حوض میں آکر جمع ہوتا تھا۔ چونکہ یہ منزل صاف ستھری نہ تھی اس لئے میں اس جگہ تھوڑی دیر ٹھہرا۔ میں نے گکھڑوں سے پوچھا کہ اس حوض

کی گہرائی کس قدر ہو گی؟ لیکن انہوں نے کوئی ایسا جواب نہ دیا جس سے یہ گہرائی واضح طور پر معلوم ہو سکے
انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا سے سنا ہے کہ اس پانی میں مگرمچھ رہتے ہیں اور جو جانور
اس پانی میں اترتے ہیں وہ زخمی ہو کر باہر نکلتے ہیں۔ اس وجہ سے کوئی اس پانی میں اترنے کی جرائت
نہیں کرتا۔ میں نے ایک بکرے کو اس پانی میں ڈالنے کا حکم دیا۔ بکرا پورے حوض میں تیر کر باہر نکل آیا۔
اس کے بعد میں نے ایک فراش کو اس پانی میں اترنے کا حکم دیا۔ وہ بھی اسی طرح تیر کر صحیح و سالم
باہر نکل آیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جو بات گکھڑوں نے کہی تھی اس کی کوئی اصلیت نہ تھی۔

راجہ جہانداد عرف جھنڈے خان کے دورِ حاکمیت یعنی اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف
اوّل میں راولپنڈی ایک بڑے قصبے کی صورت اختیار کر چکا تھا کیونکہ جھنڈے خان نے بھیرہ میانی
پنڈ دادن خان اور چکوال کے تاجروں کو پنڈی میں آباد ہونے کی سہولتیں بہم پہنچائی تھیں جہلم
کے کنارے پر آباد بہت سے ہندو نیاریئے بھی راولپنڈی آگئے تھے۔ یہ نیاریئے دریائے سواں کی ریت
سے سونا نکال کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔

امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا کی اکیسویں جلد میں درج ہے کہ:۔

"۱۷۶۵ء میں مغلوں کی قوت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا۔ گوجر سنگھ بھنگی جو ایک طاقت ور
سکھ تھا اس نے گکھڑوں کے سلطان مقرب خان کے خلاف لاہور سے فوج کشی کی اور گجرات شہر
کے باہر ایک جنگ میں اسے شکست دی۔ مقرب خان نے جہلم کی طرف مراجعت کی اور کچھ دنوں
بعد کسی مقامی تنازعہ میں اپنے ہی قبیلے کے لوگوں نے اسے شہید کر دیا[1]۔ لیکن بہت دن نہیں گزرے
تھے کہ ان عاقبت نااندیش گکھڑوں کو گوجر سنگھ نے ایک کر کے شکست دی اور ان کے
علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ گوجر سنگھ نے پنڈی پر قبضہ کرنے کے بعد غارت گری کا بازار گرم کیا۔ اور

---

[1] : یہ تحقیق بالکل غلط ہے۔ سلطان مقرب خان کو گجرات ہی کی
لڑائی میں ایک گکھڑ رئیس سردار ہمت خان نے شہید کر دیا تھا۔ ہمت خان سکھوں سے
ملا ہوا تھا۔

محصلات کی صورت میں مالکان اراضی سے پائی پائی وصول کر کے چھوڑی۔ بڑے زمینداروں ہی کی بات نہیں چھوٹے چھوٹے مزارعین بھی سکھاشاہی کی اس لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنے۔ گوجر سنگھ مدت العمر ضلع راولپنڈی کا مالک و مختار رہا اور اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا صاحب سنگھ اس کی گدی پر بیٹھا۔ ۱۸۱۰ء میں جب پوٹھوہار کے علاقے کو رنجیت سنگھ نے سکھ ریاست کا حصہ قرار دے دیا تو صاحب سنگھ کی جگہ ملکھا سنگھ تھیپوریا کو ضلع کا حاکم بنا دیا — مگر اس سے پہلے صاحب سنگھ نے افغانوں کی مداخلت اور گکھڑوں کی مدافعت کے باوجود پنڈی اور اس کے گردا گرد سکھ دربار کی مرضی اور منشا کے خلاف تین لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کی زمینیں ذاتی قبضہ میں کر لی تھیں۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں چتر سنگھ اور اس کے بیٹے شیر سنگھ نے گجرات کے معرکہ میں شکست کھائی اور ۱۴ مارچ (بہ روایت دیگر۔ ۲ اپریل) ۱۸۴۹ء کو راولپنڈی میں جنرل گلبرٹ کے سامنے ہتھیار رکھتے ہوئے شکست نامہ پر دستخط کر دیئے۔

اسی موقع پر ایک سکھ فوجی نے کہا تھا "آج مہاراج رنجیت سنگھ ہوری موئے نیں"۔

۱۸۵۳ء میں مانڈلہ کے گکھڑ نادر خان نے (جو سلطان مقرب خان کی بیٹی کا پوتا تھا) انگریزوں کے خلاف ایک عظیم بغاوت کا بازار گرم کیا۔ اس بغاوت میں رنجیت سنگھ کا ایک فرضی بیٹا پرنس پشورا سنگھ بھی شریک ہو گیا۔ جسے اٹک کے قریب قتل ہوئے کئی برس گزر چکے تھے مگر یہ کہانی گھڑی گئی کہ پشورا سنگھ قتل نہیں بلکہ روپوش ہو گیا تھا۔ اور اب بال کٹوا کر مونا سکھ کے روپ میں پنجاب کی سلطنت کے وارث ہونے کا داعیہ دار ہے۔ بہرکیف نادر خان کی بغاوت ناکام ہو گئی۔ راولپنڈی میں مقدمہ چلا اور اس مجاہد کو سنٹرل جیل راولپنڈی کے صدر دروازہ کے سامنے توپ دم کر دیا گیا۔

نادر خان شہید کی وجہ سے سلطان حیات اللہ پر بھی افتاد پڑی بلکہ بھیر والہ کا پورا خاندان زیر عتاب آ گیا۔ یہ سلطان حیات اللہ وہی ہیں جنہیں ۱۸۴۸ء میں مسٹر ایبٹ نے ڈوگراں کی قید سے رہائی دلائی تھی۔ ان کے بیٹے راجہ کرم داد خان تھے جو گکھڑوں کے چیف تھے۔ انہوں نے انگریزوں

کی دی ہوئی جاگیریں اور خطابات تحریک خلافت میں واپس کر دیئے تھے۔ راجہ حسن اختر مرحوم ان کے بیٹے تھے۔

جنرل کننگھم کی رپورٹ کے مطابق جہاں راولپنڈی کی موجودہ کنٹونمنٹ ہے یہاں پہلے ایک قصبہ غزنی پور یا گنجی پور کے نام سے موجود تھا اور یہ قدیم زمانہ میں بھٹی قبیلے کے زیر تسلط تھا۔ شکستہ اینٹیں قدیم یونانی اور دوسرے سکے دو مربع میل کے رقبہ میں پائے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصبہ خاصہ بڑا تھا ـــــ نیز پنڈی سے کوئی تین میل دور شمال کی جانب غزنی نام ایک گاؤں اب بھی موجود ہے اور یہ نام قدیم گنجی پور سے ملتا جلتا ہے۔ جنرل کننگھم یہ بھی لکھتا ہے کہ کسی زمانہ میں اس کا نام "فتح پور باوری" بھی رہا ہے۔

۱۸۵۱ء میں لارڈ ڈلہوزی نے راولپنڈی کو ناردرن کمانڈ کی ۵۳ ویں رجمنٹ کا مستقر بنا کر یہاں متحدہ ہندوستان کی سب سے بڑی چھاؤنی کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۷۹ء میں پنڈی تک ریلوے لائن بچھانے کا کام شروع ہوا اور یکم جنوری ۱۸۸۶ء کو ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی سال ریلوے روڈ پر سیڑھیوں والا پل بھی تیار ہوا۔

چھاؤنی کے قیام کے ساتھ ہی نالہ لئی شہر اور چھاؤنی کے درمیان حدِ فاصل قرار پایا۔ ان دنوں یہ صاف ستھرے پانی کا نالہ تھا۔ ۱۹۲۰ء تک اسلامیہ ہائی سکول کے طلباء ظہر کی نماز کے لئے اسی کے پانی سے وضو بنا کر نماز ادا کیا کرتے۔ تیہ بند سے اوپر دیہات کے لوگ اسی پانی کو پیتے اسی کے کنارے متعدد مقامات پر پن چکیاں لگی ہوئی تھیں جن میں سے دو پن چکیاں ۱۹۲۱ء تک ستی صدر روڈ کے پل کی دائیں جانب موجود تھیں۔ ان دنوں شہر کے مرکزی گندے نالے کو اس میں نہیں گراتے تھے بلکہ اس کا پانی کالج روڈ کی طرف سے لے جا کر لیاقت باغ کے سامنے کھلے کھیتوں کے بیچوں بیچ بنے ہوئے ایک پختہ تالاب میں جمع کیا جاتا اور مقامی کاشت کار میونسپلٹی سے یہ پانی قیمتاً خرید کر اپنے کھیتوں میں چھوڑا کرتے۔ اب یہ کھیت معدوم ہوئے اور ان کی جگہ آریہ

محلہ کے بلند و بالا مکانات تعمیر ہو گئے۔ تالاب کا خرابہ ماضیٔ قریب تک موجود تھا۔ اب اُسے پُر کر کے خاکروبوں کے کوارٹر بنا دیئے گئے ہیں اور گندے نالہ کو گوالمنڈی کے قریب نالہ لئی میں پھینک دیا گیا ہے۔ شہر کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں یہ شہر سرراہِ کشمیر ایک پڑاؤ کی حیثیت رکھتا تھا۔ محلہ نیاریاں میں ایک مسجد "گولیاں والی" اب بھی موجود ہے جو ۱۰۱۰ ہجری میں جہانگیر کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ محلہ نیاریوں کے یہاں آباد ہونے سے پہلے "محلہ سرائیں" کہلاتا تھا کیونکہ مسجد کے برابر ایک بڑی سرائے تھی جس میں کشمیر اور پشاور جانے والے قافلے اور سیاح آکر ٹھہرا کرتے۔

پیرودھائی کے قبرستان کے عقب میں لئی کے کنارے ہندوؤں کی شمشان بھومی تھی۔ وہ اپنے مُردوں کو سپردِ آتش کرنے کے بعد نالہ لئی میں اشنان کیا کرتے۔ یہیں انہوں نے ایک تالاب بھی بنوایا اور لئی کے پانی کو اس میں چھوڑ کر گرداگرد آدم قد چار دیواری کھینچ دی جہاں گرمی کے دنوں میں ہندو خواتین نہانے جاتیں۔ چار دیواری کے باوصف تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے اور چھپ چھپا کر دلربا منظر دیکھتے۔ غالباً ایسے ہی توبہ شکن منظر کے بارے میں شاعر نے کہا ہوگا ― "رَن چھپڑوں نہا کے نکلی سُلفے دی لاٹ ور گی"

نالہ لئی کا سہاگ ساون رت کے تین چار شبانہ روز ہوتے ہیں۔ جب نواحی پہاڑوں سے برکھا کا پانی بہہ کر سیلاب کی شکل میں آجاتا ہے۔ ۱۸۹۴ء میں یہاں شدید سیلاب آیا تھا۔ سٹی صدر روڈ اور مری روڈ والے دونوں پل پانی میں ڈوب گئے تھے آس پاس کے لکڑی کے گوداموں کے سارے تختے بہہ نکلے۔ گوالمنڈی زیرِ آب آگئی۔ شہر میں سیلاب کا پانی بوہڑ بازار تک جا پہنچا۔ لوگ تیر کر آر پار آنے جانے لگے۔

سیلاب کے دن گزر جاتے ہیں تو لئی کا اصل سنگار جوبن پر آجاتا ہے۔ گندگی کے طومار ہر طرف تیرتے پھرتے ہیں۔ ۵۸ء کے مارشل لاء کے دوران مصنوعی ہلدی اور مرچوں کے ذخائر جب

اس میں پھینکے گئے تو پانی رنگ دار ہو گیا تھا۔

ویسے نالہ لئی پنڈی کی سمت کو متعین کرنے میں ضرور مدد دیتا ہے۔ یہ گندگی کی پوٹ ہی نہیں بلکہ سارے شہر کی تہذیب کو اپنے بطن میں سمیٹ کر اپنے ساتھ بہائے لئے جاتا ہے اور پنڈی شہر پر نگاہ واپسیں ڈالتا کسمساتا پیچ بل کھاتا گذرتا ہے اور ہر موڑ پر کہتا جاتا ہے۔ خدا حافظ خدا حافظ۔ خدا حافظ۔

ٹیکسلا

ٹیکسلا کا اصل نام "ٹکا شسلا" ہے جس کے معنی ہیں "تراشیدہ پتھروں کا شہر"۔!

ٹیکسلا کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ یونانی اور چینی مصنفوں کی یادداشتیں چند سکے اور کچھ نادر کتبے ہیں۔

ٹیکسلا تاریخ کے عہد عتیق کی یادگار ہے۔ مہابھارت میں اس بستی کے فاتح "جنم جائے" کی طرف سے دی گئی "ناگ بھینٹ" کے سلسلے میں اول اول اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ پھر پانچویں صدی قبل مسیح میں اس کا ذکر ایران کے بادشاہ دارا کے عہد کے کتبوں میں ملتا ہے۔ جب یہ ایرانی سلطنت کا حصہ تھا۔ بالخصوص ٹیکسلا کے آثار میں مرمر کا ایک ستون بھی ہے جو سائرس اوّل کے زمانے کا ہے۔ جس پر ایرانی زبان میں عبارت کندہ ہے۔

ایرانیوں کا عہد حکومت محض سیاسی غلبہ تک محدود نہ تھا بلکہ انہوں نے اپنا تمدن بھی یہاں پھیلایا۔ لوہے کا استعمال بھی یہاں اسی عہد میں شروع ہوا۔ انہوں نے ٹیکسلا میں ایک "دارالضرب" کھولا جہاں مقامی ڈھنگ میں ایرانی معیار کے مطابق سکے ڈھالے گئے۔ ایرانیوں نے آرامی زبان اور رسم الخط بھی رائج کیا۔ ذرائع آمد و رفت اور تجارت کو بھی تحفظ بخشا۔ کابل میں مرضع بگرام۔ پشاور کے قریب چارسدہ اور پنجاب کی حدود میں ٹیکسلا تجارتی قافلوں کے

کے مشہور پڑاؤ تھے۔ ظاہر ہے کہ تجارتی روابط صرف اشیائے فروختنی ہی نہیں لاتے اپنی زبان اور خیالات بھی پھیلاتے ہیں۔

اس حقیقت کا اشارہ بدھ مت کی کتابوں میں بھی ملتا ہے کہ ٹیکسلا کو صدیوں علوم و فنون کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ تاہم سکندر اعظم کے حملہ سے پہلے اس کی تاریخ کچھ زیادہ واضح نہیں ہے۔ سکندر کی پیش رفت ایرانیوں ہی کے جانشین کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے دارا ثالث کی مکمل شکست کے بعد ایرانیوں کے قدیم مقبوضات پر سکندر اعظم کا دعویٰ غلط نہیں تھا۔ لیکن اس خطہ میں سکندر کی یورش اتنی اہم نہیں جتنی ایرانیوں کی شکست کا واقعہ ہے۔

ایرانیوں نے تعمیرات کے علاوہ صنعت و حرفت اور فنون کو بھی امتیازی فروغ بخشا تھا۔ لیکن سکندر کی یلغار تیز و تند آندھی کی طرح امڈی اور آناً فاناً نکل گئی۔ تاریخ نے اس لمحہ کو اس حیثیت سے دیکھا کہ اسی آندھی کے گرد و غبار سے موریا خاندان کی عظیم سطوت نمودار ہوئی اور ایک مرتبہ پھر ایران کے چرب دست صنّاعوں کو یہاں پناہ ملنے لگی۔

یہ بات مبالغہ سے بالا ہے کہ یہی ہندی و ایرانی" دور اینٹ پتھر کی پختہ تعمیرات کا نکتۂ آغاز ثابت ہوا۔ اس سے پہلے ۳۲۶ ق م میں راجہ امبھی نے بھیر پہاڑی پر سکندر اعظم سے باتیں کرتے ہوئے بطور تفاخر کہا تھا۔ "منظر کی وسعتوں میں دور پار بکھرے ہوئے مکانوں کی دیواروں تک میری سلطنت کی حدیں پھیلی ہوئی ہیں۔"

سر جان مارشل لکھتا ہے کہ اس وقت بھیر ماؤنڈ کی بلندی پر کھڑے یونانی فاتح سکندر اعظم کی نگاہ جس منظر کو دیکھ رہی تھی وہاں کوئی قابلِ ذکر عمارت موجود نہ تھی۔ مٹی کے کچے گھروندے اور کھپریلیں ہوں گی اور خال خال کوئی پختہ اور خوش وضع عمارت رہی ہوگی جسے دارالسلطنت کی عظمت کا آئینہ دار کہا جا سکے۔"

اس صورت حال کو بستی کی تمدنی پستی پر بھی محمول سمجھا جا سکتا ہے مگر یہ بھولنا نہ چاہیئے کہ سکندر اعظم کی نظر اس وقت محض چند دیہات پر تھی جو شہر کے حوالی میں پھیلے ہوئے تھے پوٹھوہار کے دیہات کے کچے مکانوں کی ہیئت تعمیر اس وقت تو کیا آج سے نصف صدی پہلے تک ایسی ہی تھی جیسی یونانی پرچہ نویسوں نے ۳۲۶ ق م میں دیکھی ہوگی۔

ویسے ٹیکسلا کے کھنڈرات سے برآمد ہونے والے زیورات کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ مالِ غنیمت کا یہ پشتارہ سکندر اعظم اپنی طوفانی یلغار کے دوران یہاں دفن نہیں کر گیا تھا اور نہ سیم وزر کے یہ انبار ایرانیوں نے یہاں امانت چھوڑے ہوں گے کہ وقت کسی روز انہیں بے نقاب کر کے عجائب خانے کی زینت بنا دے گا۔ بہر عنوان یہ پونجی اسی سرزمین کے مکینوں کی تھی۔

کھدائی کے دوران بہت سی اشیا دریافت ہوئیں جن میں گل دان، منقش پتھر گوتم بدھ کے مجسمے جن میں یونانی تراش نمایاں ہے۔ ۶۰۰ ق م کے سکے۔ دھات اور بلور کے عمدہ برتن شامل ہیں ــــ ونسنٹ اسمتھ انہی کے بارے میں کہتا ہے۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تمدن کے اعلیٰ مدارج اس وقت تک طے کر لئے گئے تھے اور لوگ تمام ایسے فنون اور صنعتوں سے شناسا ہو چکے تھے۔ جو متمول اور متمدن ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ــــ"

سونے چاندی کے زیورات اس عہد عتیق کی خوشحالی ہی نہیں ذوق جمال و نظر کا پتہ بھی دیتے ہیں ہلکی پھلکی انگشتریاں، بھاری بھرکم کنگن، چھل چھل کرتے پازیب بھی برآمد ہوئے۔ ہاں وہ پائے نازک ہی اب کہیں خراماں نہیں ہیں جن کی رفتار سے پازیب کی نغمہ بار جھنکار کبھی سر بازار ابھرتی ہوگی۔

ایرین (ARRIAN) لکھتا ہے ــــ چندر گپت موریا کے عہد میں "سب سے پرانا شہر ٹیکسلا تھا جو وسیع اور خوشحال تھا ــــ"

سٹرابو (STRABO) بھی ٹیکسلا کو ایک بڑا شہر قرار دیتا ہے جس میں اعلیٰ قانون

کی عملداری تھی۔

"ٹیکسلا کے کھنڈر علوم و فنون کے اس عظیم مرکز کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتے ہیں یہاں ایک یونیورسٹی تھی جو علوم کا محور تھی، شہر میں طلباء کے رہائشی کمرے اور اقامت گاہوں کا پتہ چلتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ یونیورسٹیاں وہیں بنا کرتی ہیں جہاں ترقی یافتہ تہذیب موجود ہوتی ہے اور ٹیکسلا کا شہر ایسے مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جہاں ایشیا کے تمام حصوں کے طلباء حصول علم کی خاطر آیا کرتے اور اس طرح اسے مختلف تہذیبوں کا سنگم بھی کہا جا سکتا ہے۔

جدید اصطلاح کے اعتبار سے ٹیکسلا کسی ایسی یونیورسٹی کا درجہ نہیں رکھتا تھا جس میں باضابطہ طور پر داخلے کی شرائط، طریق تعلیم اور امتحانات کا تعین ہو۔ اسے محض ان معنوں میں یونیورسٹی کہا گیا ہے کہ یہاں علوم و فنون کے چیدہ چیدہ اُستاد موجود تھے۔ طلباء کو درس دینا ہی ان کا دھندا تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے سے بلکہ وسطی ایشیا تک سے طالبانِ علم ان کے پاس آتے اور علم و دانش کا اکتساب کرتے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ صرف اشوک کے عہد میں خواندگی کا تناسب موجودہ بھارت سے کہیں زیادہ تھا۔

طالب علم عموماً سولہ برس کی عمر میں یہاں آتے اور برسوں یہاں رہ کر علوم سیکھتے۔ کہتے ہیں ۶۸ مختلف علوم کی تعلیم و تدریس کا یہاں انتظام تھا جس میں علم الادویہ اور جراحت وغیرہ علوم کے علاوہ تیر اندازی اور تیغ زنی بھی شامل ہے۔ شاہی خانوادوں کے راجکمار فنونِ سپاہ گری سیکھنے کے لئے یہاں بھیجے جاتے۔

ول ڈیورنٹ لکھتا ہے کہ اس دور میں اور بھی عظیم درس گاہیں موجود تھیں جو بنارس۔ اجنتا۔ وودربھا اور اُجین میں قائم ہوئیں مگر معالجات کی تعلیم کا اہتمام ٹیکسلا کے سوا اور کہیں نہ تھا۔ جواہر لال نہرو کے بقول گوتم بدھ جب کبھی علیل ہوتا ٹیکسلا ہی کے کسی فارغ التحصیل معالج کو علاج کے لئے طلب کیا جاتا۔"

تعلیم کا سلسلہ طلوعِ صبح کے وقت شروع ہو جاتا اور دوپہر تک جاری رہتا پھر کھانے اور آرام کا وقفہ ہوتا۔ اس کے بعد طلبا اپنا آموختہ دہراتے۔

اساتذہ اپنی فیس تعلیم کے آغاز یا تکمیل کے مرحلہ پر وصول کیا کرتے۔ تعلیم کی مدتِ تکمیل اوسطاً بارہ برس سمجھی جاتی۔ فیس طلبا کی حیثیت کے مطابق لی جاتی اور صاحبِ استطاعت طلبا کو استاد نسبتاً شفقت سے پڑھاتے۔ نادار طلبا کو بھی داخلہ مل جاتا مگر فیس کے بدلے استاد کی نجی خدمات انجام دینی پڑتیں۔ بسا اوقات انہیں دو حرف سیکھنے کے لئے سارا سارا دن انتظار کرنا پڑتا۔ بعض اساتذہ کے پاس بیک وقت پانچ پانچ سو طالب علم تعلیم حاصل کرتے۔ استاد کو نائب مدرسین کی امداد بھی حاصل ہوتی اور یہ اکثر فارغ التحصیل اور ذہین طلبا ہوا کرتے استاد درختوں کے سائے میں بیٹھ کر پڑھاتے۔ سامنے کھردرے فرش پر شاگرد ہمہ تن گوش بیٹھے ہوتے یہ یونانیوں کا طریقِ تدریس تھا جیسا کہ ارسطو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر درس دیا کرتا تھا۔

موریا خاندان سے لے کر گپت خاندان تک سنسکرت کی جگہ پراکرت کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا۔ سنسکرت کا استعمال آجین کے ساکا خاندان کے عہد میں شروع ہوا۔ تاریخی اعتبار سے گوتم بدھ کے زمانے میں عوام کی مقامی اور مقبول بولیاں جو سنسکرت سے آسان تر تھیں ہر جگہ استعمال ہونے لگیں۔ اشوک کے عہد کے کتبے جو ستونوں اور چٹانوں پر ملتے ہیں تقریباً پراکرت میں لکھے گئے تھے۔ پراکرت ایک رنگ سے بدھ مذہب کی سنسکرت تھی۔ پالی زبان بھی پراکرت ہی کی ایک عام فہم شکل تھی۔ پالی زبان آج بھی لنکا برما وغیرہ کے بودھوں کی زبان ہے۔

ٹیکسلا میں ایک ایسا بھی دور آیا کہ قدیم ویدک اور ایرانی دانش گڈ مڈ ہو گئی۔ اس عہد کے متعصب برہمن ٹیکسلا کو اس راہ سے ناپاک تصور کرنے لگے کہ اس میں بدیشی یعنی ایرانی اقدار کا غلبہ ہو گیا تھا۔

اسی علمی مرکز سے تین مشہور ترین ہستیاں وابستہ رہی ہیں۔ ایک ان میں سے زبان دانی کا ماہر پنینی تھا۔ دوسرا چانکیہ اور تیسرا کرا کا جو آیور ویدک فن دوا سازی کا ماہر تھا۔

پنینی نے سنسکرت زبان دانی کے قواعد اور گرائمر کے چار ہزار اصول مرتب کئے اور کم و بیش ایسے دو ہزار الفاظ کے مادے تلاش کئے جن کی ترکیب سے زبان پر کامل عبور ہو سکتا ہے۔ پنینی کی گرائمر کو دورِ قدیم کا سب سے بڑی علمی تحقیق کا درجہ حاصل ہے۔

ٹیکسلا کے کھنڈر راولپنڈی سے بیس میل دور شمال مشرق کی طرف ایک خوشنما وادی میں واقع ہیں۔ دریائے ہرو بیچوں بیچ بہتا ہے اور پانی کی فراوانی ہے۔ ایک جانب ہزارہ اور مری کے برف پوش کوہسار ہیں اور جنوب مغرب میں مارگلہ اور اونچی پہاڑیاں ہیں۔

دورِ قدیم میں ہندوستان کو وسطی اور مغربی ایشیا سے ملانے والی تجارتی شاہراہ پر واقع اس شہر کو قدرتی دفاعی حیثیت۔ آب و گل و سبزہ کی فراوانی اور زمینوں کی زرخیزی و شادابی کی وجہ سے خاصی اہمیت حاصل رہی۔ بالخصوص سکندر کی آمد کے وقت اٹک اور جہلم کے مابین یہی ایک قابلِ ذکر اور گنجان آباد شہر تھا۔

اس کی وسعت میں بالخصوص جنوبی حصہ میں بے شمار یادگاریں موجود ہیں جن میں سے بیشتر بدھ مت کے سٹوپا اور خانقاہیں ہیں جن میں سب سے اہم "دھرم چیکا سٹوپا" ہے۔ جسے مقامی لوگ "چیر توپ" کہتے ہیں۔ ہتھیال پہاڑ کے آس پاس کچھ اور یادگاریں ہیں جن میں ایک خانقاہ بھی ہے۔ مشرق کی جانب موہڑہ مرادو اور جولیاں کے کھنڈر ہیں۔ مشرق کی جانب بادل پور اور لال چیک کے کھنڈر ہیں۔ کچا کوٹ کے قریب جنڈیال کے مقام پہ ایک بہت بڑا معبد ہے جو یقیناً زرتشتوں کا آتش کدہ رہا ہوگا۔ اس کے قریب ہی دو چھوٹے سٹوپا ہیں۔ جو جین مت کے مندر معلوم ہوتے ہیں۔

ٹیکسلا کی وادی میں ساڑھے تین میل کے رقبہ میں تین پُرانے شہروں کے کھنڈر ملے ہیں

(ویسے ڈھیری شاہاں سے عثمان کھٹر تک جہاں بھی زمین کھودیں آثار برآمد ہوتے ہیں) جنوبی حد کے سرے پر قدرے بلند مگر ہموار سطح پر بھیر پہاڑی کا شہر ہے جو سب سے قدیم اور بڑا ہے جس کا رقبہ دو میل کو محیط ہے۔ اشوک کے عہد میں بھیر پہاڑی ہی کو مرکز تعلیمات کی حیثیت حاصل تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہیون سانگ کے وقت بھی یہ شہر آباد تھا۔

دوسرا شہر "سرسکھ" تھا۔ یہ لنڈی نالہ کے متصل شمال مشرق میں ہے۔ اس شہر کو غالباً کنشک کے دور میں تعمیر کیا گیا ہوگا۔ یہ ٹیکسلا کا جدید ترین شہر تھا۔ اس کا نقشہ متوازی الاضلاع ہے جس کا گھیرا تین میل کے پیٹے میں ہوگا۔ یہاں اب میر پور، ٹوفکیاں اور پنڈ گاکھڑا نام کے تین گاؤں آباد ہیں جن کے آس پاس بکھرے ہوئے ملبہ میں پرانے شہر کے آثار ملتے ہیں

مارگلہ کے مغربی کنارے پر ہتیال کے کھنڈر ہیں جس کے مشرق کی جانب سرکپ واقع تھا۔ جو تیسرا بڑا شہر تھا۔ یونانیوں کی آمد سے پہلے دوسری صدی عیسوی کے لگ بھگ اسی شہر کو دارالخلافہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے بعد بھی کم و بیش ہر عہد میں یہی دارالحکومت رہا۔ یہ شہر دو صدی قبل مسیح میں بسایا گیا ہوگا اور کشان عہد تک آباد رہا ہوگا۔ ہم اسے ایک قلعہ بند بستی بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کے گرداگرد فصیل موجود تھی۔ یہ فصیل چھ ہزار گز لمبی اور پندرہ سے اکیس فٹ چوڑی ہے۔ شہر کے اندر محلات، مندر اور رہائشی مکانات تھے۔ فصیل کے مشرق میں وہ سٹوپا ہے جسے ہیون سانگ نے "کنال کنڈل" کا نام دیا ہے اور جسے اشوک نے اپنے بیٹے کنال کی یاد میں اس مقام پر بنایا جہاں اس کی آنکھیں نکالی گئی تھیں۔

کنال کنڈل کی دیومالائی کتھا کچھ یوں ہے:

"اشوک کے بیٹے کنال کی خوبصورت اور مدبھری آنکھوں پر اس کی سوتیلی ماں فریفتہ ہوگئی مگر پاک باز راج کمار کے انکار پر رانی کی سلگتی محبت کی آنچ نفرت اور انتقام کے شعلوں میں بدل گئی اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ اشوک کسی طرح کنال کو ٹیکسلا کا گورنر بنا کر بھیج دے۔ یہ منصوبہ کامیاب

رہا۔ تاہم اشوک نے چلتے وقت کناّل سے کہا کہ وہ مرکز سے جاری ہونے والے تمام احکامات کی صحت کو جانچنے کے لئے مہر پر اس کے دانتوں کا نشان ضرور دیکھ لیا کرے۔

چند ماہ بعد رانی نے کناّل کے سرکاری مشیروں کے نام اشوک کی طرف سے ایک جعلی مراسلہ بھیجا کہ کنال کی آنکھیں پھوڑ کر اس کی بیوی سمیت پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا جائے تاکہ وہ دونوں وہاں سسک سسک کر مر جائیں۔ اس مراسلہ پر رانی نے سرخ لاکھ کی مہر لگانے کے بعد اشوک کے دانتوں کا نشان اس وقت لگا لیا جب وہ سو رہا تھا۔

مراسلہ موصول ہونے پر مشیروں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس حکم نامہ پر کیسے عملدرآمد ہو۔ راجکمار نے ان کی مضطرب حرکات کو دیکھتے ہوئے باصرار ماجرا دریافت کیا اور قصہ معلوم ہونے پر کہا کہ میرے باپ کے حکم کی فوری تعمیل کی جائے کیونکہ مُہر پر دانت کا نشان اس تحریر کی صحت کا بیّن ثبوت ہے۔ چنانچہ راجکمار کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔

اس کے بعد کنال اپنی وفا شعار بیوی کو لے کر ٹیکسلا سے نکلا اور نگر نگر بھیک مانگتا ہوا پاٹلی پتر کی راجدھانی پہنچ گیا اور شاہی محل کے باہر بچشمِ پُرنم بربط پر ایک نوحہ الاپنا شروع کیا۔ اشوک اس وقت ایوانِ شاہی کی بالائی منزل پر تھا۔ اس نے راجکمار کی آواز پہچان لی اور اپنے پاس بلوا کر جب اس کی بصارت سے محروم آنکھوں کو دیکھا تو بے حد ملول ہوا اور سازش کا احوال کھلتے ہی اپنی رانی کو آگ کے الاؤ میں جھونکنے کا حکم دے دیا۔

پھر کنال کو گھوش نامی ایک مہاتما کے پاس لے جایا گیا تاکہ وہ کوئی ایسی تدبیر کرے جس سے کنال کو آنکھیں مل جائیں۔ مہاتما نے اگلے روز ایک اجتماع بپا کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ ہر شخص اپنے ساتھ ایک خالی پیالہ بھی لائے۔ کہتے ہیں لوگ اس اجتماع میں حاضر ہوئے اور مہاتما کے وعظ کو سن کر بے اختیار زار زار روئے اور ان کے آنسو پیالوں میں گرے۔ ان تمام آنسوؤں کو سونے کے ایک بڑے برتن میں جمع کیا گیا۔ اور مہاتما نے کہا کہ میں نے بدھ مان گوتم

کے جس پُراسرار نظریۂ تعلیم کا اس سمے پرچار کیا ہے اگر وہ غلط نہیں تو راج کمار ان آنسوؤں سے اپنی آنکھیں دھوئے تو بصارت لوٹ آئے. چنانچہ اس عمل سے راج کمار کو آنکھوں کی روشنی نصیب ہوگئی پھر اشوک نے ٹیکسلا کے اس مقام پر جہاں راج کمار کنال کی آنکھیں پھوڑی گئی تھیں ایک سٹوپا تعمیر کرنے کا حکم دیا. ساتویں صدی عیسوی تک ٹیکسلا آنے والے سیاح اس کو دیکھتے رہے. اب اس سٹوپا کا کوئی نشان باقی نہیں البتہ ایک تالاب کے بقیہ آثار ملتے ہیں جسے "کنال کنڈل" کہا جاتا ہے.

مدتوں پوٹھوہار کے ہندو جن کی بینائی میں فتور ہوتا یہاں یاترا کے لئے آتے — اسی قدیم روایت کی بنیاد پر ٹیکسلا میں آنکھوں کے عطائی معالج ہر دور میں موجود رہے — اور اب امریکن مشن کا قائم کردہ آنکھوں کا ہسپتال بھی پون صدی سے ٹیکسلا میں موجود ہے.

سُکھو

قصبہ سکھو گوجر خان سے نو میل مغرب کی سمت واقع ہے. آبادی کم و بیش پانچ سات ہزار ہے. قیام پاکستان سے پہلے یہ کافی مشہور بستی تھی اور گوجر خان سے چکوال تک تجارتی اعتبار سے شاید ہی کوئی قصبہ اس کے برابر ہو. یہاں رہنے والے سکھ تجارتی میدان میں بہت زیادہ ترقی کر گئے تھے.

سکھوں کے عہد میں یہاں ایک قلعہ بھی موجود تھا. جس کا قلعدار چرمل سنگھ کلر کے بیدی باوا کا خاص مشیر تھا.

قصبہ سکھو غالباً پندرہویں صدی میں ایک خدا رسیدہ درویش بابا سکھو ملک نے آباد کیا تھا. اس درویش کا مزار سکھو ریلوے سٹیشن سے تین فرلانگ جنوب میں واقع ہے. اس درویش کے آباؤ اجداد حجاز سے آئے تھے. ایک بار سکھوں کو طرفہ شرارت سوجھی اور انہوں نے

مزار سے ملحق چار ایکڑ وقف زمین پر اپنا حق جتا کر جھگڑا کھڑا کر دیا۔ اس زمین پر بے شمار درخت بھی ہیں۔ سکھوں کا کہنا تھا کہ یہ زمین کسی باوا سکھا سنگھ کی ہے اور مسلمانوں نے ہم سے یہ جگہ زبردستی چھین کر اس پر فرضی مزار تعمیر کر لیا ہے۔ لہٰذا یہ وقف زمین ہم کو واپس ملنا چاہیئے۔ تنازعہ طول پکڑ گیا اور سکھوں نے مقدمہ دائر کر دیا۔ سیشن جج راولپنڈی نے دونوں فریقوں کے دلائل سننے کے بعد موقع دیکھنا ضروری سمجھا اور ایک مقررہ دن سکھو آیا۔ فریقین آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ جج کی کچہری لگ گئی۔ مسلمانوں نے جہلم سے ایک پشتینی میراسی فضل احمد کو بلوالیا تھا جسے اس علاقہ کے نئے پرانے تمام افراد اور ان کے آباؤ اجداد کے نام سلسلہ بہ سلسلہ یاد تھے ایسے میراسیوں کو پوٹھوہار میں "دادکا" کہا جاتا ہے۔ اس "دادکا" نے سکھو ملک کے حالات بیان کئے اور پھر ان کا شجرۂ نسب تیرھویں پشت میں ایک معزز مہاجر خاندان سے جا ملایا جو یہاں آ کر آباد ہوا تھا۔ سیشن جج نے "دادکا" کی باتیں غور سے سنیں اور وہیں کھڑے کھڑے اپنا فیصلہ سنا دیا جو مسلمانوں کے حق میں تھا۔

حسن ابدال

حسن ابدال چھوٹا سا قصبہ ہے جو کیمبل پور سے ۲۵ میل مشرق کی جانب واقع ہے۔ یہاں ایک پہاڑی پر حسن ابدال ولی قندھاری کی نشست رہی اور اب وہاں لوگ زیارت کے لئے آتے جاتے ہیں۔ پہاڑی کے دامن میں سکھوں کا مشہور تیرتھ "پنجہ صاحب" ہے جہاں بیساکھی کے دنوں میں میلہ لگتا ہے۔ تیرتھ میں پانی کا ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس میں سکھ لوگ اپنے عقیدہ کے مطابق اشنان کر کے پوتر ہو جاتے ہیں۔ تالاب کے کنارے شمالی رُخ پر ایک چٹان ہے جس پر ہاتھ کے پنجے کا نشان ثبت ہے۔ سکھوں کی روایت ہے کہ گورو نانک دیوجی اپنے دو چیلوں کے ساتھ سفر کے دوران یہاں کچھ دیر ٹھہرے۔ انہیں سخت پیاس لگی تھی۔ پہاڑی پر بابا

حسنؒ سے جو مصروفِ عبادت تھے پانی منگوا بھیجا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ گورو جی کے بار بار اصرار پر بابا حسنؒ نے اوپر سے ایک چٹان لڑھکا دی۔ گورو جی نے اس چٹان کو اپنے ہاتھ سے روکا اور وہاں "پنجے" کا نشان ثبت ہوگیا اور ساتھ ہی پانی کا چشمہ اُبل پڑا۔

یہ روایت تو سکھوں کی ہوئی اس کے برعکس جنرل کننگھم کی تحقیق کے مطابق سکھوں کے دورِ حکومت کے آخری ایام کا واقعہ ہے۔

یہاں ایک لنگڑا اسنگ تراش "کما" رہا کرتا تھا۔ ایک روز سکھ اپراجیوں کے ایک دستہ نے قصبہ کو لوٹنے کے لئے یورش کی۔ سب مرد و زن تو بھاگ نکلے۔ کما لنگڑا اور معذور ہونے کی وجہ سے بھاگ نہ سکا اور اس کے زرخیز ذہن نے ایک تجویز سوچی۔ ہتھوڑے چھینی سے پنجے کا نشان چٹان پر کھود کر خاموش بیٹھ گیا۔ سکھ جب لوٹ مار کرتے ہوئے اس طرف آئے تو اس سے پوچھا کہ تُم یہاں بیٹھا کیا کرتا ہے اس نے اپنی چرب دستی کے علاوہ حاضر دماغی کا بھی ثبوت دیتے ہوئے ایک وضعی کہانی انہیں سنائی کہ میں گورو نانک جی کے اس متبرک پنجے کی حفاظت کر رہا ہوں اور چشمہ ان ہی کی کرامت سے پھوٹا تھا۔ ہمارا خاندان کئی پشتوں سے اس کا نگران ہے۔

سکھ بہت خوش ہوئے۔ ان کی عقیدت مندانہ سادگی کو تازہ رُخ عطا ہوگیا اور اس نئی دریافت نے دل کی کلی کھلا دی۔ "کما" کو انعام و اکرام سے نوازا اور یہاں گوردوارہ کی نیو رکھی۔ بیساکھی کے موقع پر یاترا کی رسم چل نکلی جو اب تک برقرار ہے۔ گویا "کما" نے سکھوں کو کام پر لگا دیا۔

یہ تحقیق اپنی جگہ خاصی وزنی ہے کیونکہ سکھوں کی مذہبی کتابوں میں ان کی اپنی روایت کو سہارا دینے والا کوئی اشارہ موجود نہیں۔ نہ جہانگیر نے اپنی سرگزشت میں اس کا کوئی ذکر کیا ہے۔ حالانکہ جہانگیر کی تیز بیں نگاہوں سے ایسی جزئیات کیسے چھپ سکتی تھیں — وہ توزک حصہ اول ص۱۹۵ پر لکھتا ہے:

"بابا حسن ابدال کے مقام سے مشرقی جانب ایک کوس کے فاصلے پر ایک آبشار ہے جس کا پانی

نہایت تیزی سے گزرتا ہے۔ کابل کے پورے راستے میں اس جیسا کوئی آبشار نہیں۔ کشمیر کے راستے میں دو تین جگہ اس قسم کے آبشار ہیں۔ اس تالاب کے درمیان جو اس آبشار کا منبع ہے راجہ مان سنگھ نے ایک مختصر سی عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اس تالاب میں مچھلیاں بکثرت ہیں۔ میں نے وہاں کے رہنے والوں سے اور مورخوں سے بابا حسنؒ کے حالات پوچھے۔ کسی نے بھی کوئی صحیح بات نہیں بتائی۔ جو جگہ اس مقام میں مشہور ہے وہ ایک چشمہ ہے جو ایک پہاڑی سے نکلتا ہے۔ اس کے پانی کی انتہائی لطافت شیرینی اور نظافت پر امیر خسروؒ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔ ؎

در تہِ آبش ز صفا ریگ خورد

کور تواند بدل شب شمرد!

آگے چل کر جہانگیر لکھتا ہے کہ خواجہ شمس الدین محمد خوافی نے جو ایک مدت تک میرے والد بزرگوار کے عہد میں عہدہ وزارت پر مامور تھا۔ وہاں ایک چبوترہ اور اس کے درمیان ایک حوض بنوایا ہے چشمہ کا پانی اس حوض میں آتا ہے اور وہاں سے کھیتوں اور باغوں کی آبپاشی میں صرف ہوتا ہے اس چبوترہ کے ایک طرف اس نے اپنے مدفن کے لئے ایک گنبد بنوایا تھا۔ لیکن وہ جگہ اتفاق سے اسے نصیب نہ ہوئی اور حکیم ابوالفتح گیلانی اور اس کا بھائی حکیم ہمام جو میرے والد بزرگوار کے مصاحب اور محرم راز تھے میرے والد کے حکم سے وہاں دفن ہوئے۔

چوہا سیدن شاہؒ:

چوہا سیدن شاہ کا قدیم نام جنڈیال تھا۔ یہ چھوٹی سی بستی دلکش مناظر اور صحت افزا آب و ہوا کے باعث ایک گونہ اہمیت رکھتی ہے۔ چشموں کی لطافت اور پھلوں کے باغات کے علاوہ خوشبودار گلاب کا حسین و جمیل چمنستان کھلا ہوا ہے۔ جس کا نکھار موسم بہار میں شباب پر آتا ہے۔ اپریل کے مہینے میں چیت کی آخری جمعرات کو یہاں حضرت سیدن شاہ شیرازیؒ

کا عرس ہوتا ہے جو سات روز کے بعد بیساکھی کے دن ختم ہو جاتا ہے۔ عقیدت مند نزدیک اور دور سے ڈالیاں لے کر حاضر ہوتے ہیں اور میلے کی ہما ہمی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ملکۂ نورجہاں کے لئے عطر گلاب ہر سال بہار کے موسم میں کشید کر کے یہاں سے بھجوایا جاتا تھا۔

۱۹۳۹ء کی دوسری بڑی جنگ سے کچھ پہلے سر سکندر حیات وزیر اعلیٰ پنجاب نے شملہ کی جگہ چوہا سیدن شاہ کو پنجاب گورنمنٹ کا گرمائی مستقر بنانے کے لئے حکومت ہند سے اجازت مانگی تھی۔ ابھی یہ معاملہ تکمیل کے مراحل میں تھا کہ لڑائی چھڑ گئی اور یہ تجویز ملتوی کرنی پڑی۔ اسی دوران سر سکندر حیات راہیٔ ملک عدم ہو گئے اور جنگ کے خاتمہ پر ملکی سیاسی مسائل کے تصفیہ کی معروفیت کے باعث کسی کو اس بستی کا دھیان نہیں آیا۔ یہاں کی مٹی میں سونے کے وافر ذرات پائے جاتے ہیں اور پانی ایسا صحت بخش ہے کہ یہاں کبھی کوئی دق سل کا مریض نہیں پایا گیا۔

چوہا سیدن شاہ کی طرح کٹر کہار بھی مناظر فطرت کے حسن میں کچھ کم نہیں ہے۔ کٹر کہار میں اونچی پہاڑیوں کے درمیان گھری ہوئی ایک خوبصورت جھیل بھی ہے جس میں مچھلی اور بطخ کا شکار کھیلتے ہیں۔ یہاں پھلدار درختوں کی بھی کمی نہیں اور ایک بڑے باغ کے اندر پانی کے دھاروں کے اوپر ایک خوبصورت کٹی ہوئی چٹان ہے جسے "تخت بابری" کہتے ہیں۔ فطری مناظر کے حسن سے متاثر ہو کر بابر نے یہاں ایک پتھر پر اپنا مشہور شعر کھدوایا تھا ع

ے نوروز و نو بہار و مئے و دلبری خوش است

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارا نیست

یہی حال کٹاس کا بھی ہے جو آب و ہوا کے لحاظ سے صحت افزا مقام ہے اور چوہا سیدن شاہ سے تین میل دور واقع ہے۔ پانی کی فراوانی ہے اور ایک قدیم تالاب بھی ہے جہاں بیساکھی کے روز ہندو نہانے کے لئے جایا کرتے تھے اور اس کے پانی کو امرت جل خیال کرتے تھے۔ کٹاس میں

کورو پانڈو کے وقت کی قائم کردہ درس گاہ "مہا ودیالہ" کے کھنڈر بھی ملتے ہیں۔ ہندوؤں کی روایات کے مطابق سیتا سوئمبر کی تقریب کٹاس ہی میں ہوئی تھی۔

مارگلہ:

شاہراہ اعظم پر پنڈی سے پشاور کی جانب سولہ میل دور مارگلہ کی گھاٹی واقع ہے جس کے قریب ہی قدیم شاہراہ کا ایک "کرنل نکلسن کی یادگار کے عقب میں جنوب مغربی سمت ایک موڑ پر آج بھی موجود ہے جو بڑے بڑے پتھروں سے بنایا گیا تھا یہیں ایک چٹان پر فارسی کتبہ بھی نصب ہے جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے (جلد اول صفحہ ۱۹)

اس علاقہ میں جو مارگلہ سے ہتیا تک ہے پوٹھوہار کہتے ہیں۔ ہتیا کو ہاتی گکھڑ نے آباد کیا تھا۔ "رہتاس" سے لے کر ہتیا تک جا بجا "بگیال" قوم کے لوگ بستے ہیں جو گکھڑوں کے خویش اور ہم جد ہیں۔ آگے چل کر جہانگیر لکھتا ہے:

"مارگلہ" ہندی زبان میں "مار" اور "گلہ" کا مرکب ہے۔ "مار" کے معنی مارنے اور "گلا" قافلے کو کہتے ہیں۔ یعنی قافلوں کے مارنے کی جگہ" "گکھڑ عجیب گفو گفتش لوگ ہیں ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ میں نے ہر چند چاہا کہ اس لڑائی جھگڑے کو ختم کیا جائے مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔"

ٹلہ جوگیاں

ٹلہ جوگیاں کوہستان نمک کے مشرق اور رہتاس سے دس میل جنوب کی طرف واقع ہے۔ یہ ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ مانا جاتا ہے۔ یہاں زمانہ قدیم میں کسی ہندو مہا پرش نے ایک عبادت گاہ بنوائی تھی۔ مہا بھارت کی جنگ کے خاتمہ پر پانچوں پانڈو یہاں یاترا کے لئے آئے تھے۔ جنرل کنگھم کی دریافت ہے کہ سکندر اعظم کے وقت بھی یہ عبادت گاہ موجود تھی۔

جہانگیر اکثر کشمیر جاتے ہوئے رہتاس میں پڑاؤ کرتا اور ٹلہ جوگیاں بھی اسے بہت پسند تھا۔ ایک مرتبہ اس نے یہاں دربار لگایا تھا۔

مانکیالہ

پنڈی سے ۲۴ میل دور اور روات سے تین میل آگے "مانکیالہ" واقع ہے۔ سیالکوٹ کے راجہ رسالو کی داستان اسی علاقہ سے متعلق ہے کہ روات میں سات دیو رہا کرتے تھے وہ ہر روز کسی نہ کسی آدم زاد کو لقمۂ تر بناتے۔ ان کی ایک بہن تھی جب دیو ترکی کے پہاڑ پر کام کے لئے جاتے۔ ان کی بہن کھانا لے کر وہاں جاتی۔ واپسی پر ایندھن ڈھو کر لاتی۔ کہتے ہیں وہ دیو زاد اتنی طاقت ور تھی کہ درختوں کو ہاتھ سے مروڑ کر گھسیٹتی ہوئی لئے چلی آتی۔ ایک روز راجہ رسالو نے ایک گھر میں کسی عورت کو خوشی کے گیت گاتے اور پھر دفعتہً روتے پیٹتے دیکھا۔ پوچھا تو اس نے بتایا کہ آج اس کے بیٹے کی شادی ہے اس لئے مسرت کے گیت گا رہی ہے اور روتی اس کارن ہے کہ آج اس کے بیٹے کو دیوؤں نے اپنا لقمہ بنانا ہے ـــــ راجہ رسالو نے عورت سے کہا اے ناری چنتا نہ کریں تمہارے پتر کی جگہ بھینٹ چڑھوں گا۔ چنانچہ راجہ رسالو گیا اور ایک ہی تیر ایسا کارگر چلایا کہ چھ دیوؤں کو چھیدتا ہوا نکل گیا۔ ساتواں دیو جس کا نام ٹھیرا ہے تیر کی زد سے بچ کر ترکی پہاڑ کی طرف نکل گیا اور ابھی تک وہیں کسی غار میں چھپا بیٹھا ہے ـــــ"

دیوؤں کے مستقر کی وجہ سے "مانکیالہ" کو "بیداد نگر" بھی کہا جاتا ہے۔

یہاں پر ایک "سٹوپا" بنا ہوا ہے جس کو عامتہ الناس توپ مانکیالہ" کہتے ہیں۔ اس تعمیر کا مقصد آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ چھوٹی اینٹ کی ٹھوس تعمیر ہے۔ اوپر دس دس پندرہ پندرہ من کی پڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ کرین کے بغیر یہ پڑیاں اوپر کیسے پہنچائی گئیں۔ یار لوگوں نے اسی حیرت کے عالم میں دیوؤں کا افسانہ گھڑا کیونکہ یہ کارنامہ انہی کا ہو سکتا ہے۔

"توپ مانکیالہ" میں جو مسالہ استعمال ہوا ہے وہ سفید رنگ کا ہے۔ اشوک کے بنائے ہوئے سٹوپا اور مندروں میں سرخ رنگ کا مسالہ استعمال ہوا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ "توپ مانکیالہ" اشوک کے عہد کی تعمیر نہیں ہے۔

راولپنڈی گزیٹر میں کسی سند کے بغیر لکھا ہے کہ یہ سٹوپا راجہ مانک نے تعمیر کرایا تھا۔

کلر سیداں:

کلر سیداں باوا گوربخش سنگھ بیدی کا مسکن تھا جو گورونانک دیوجی کے خاندان کا فرد تھا۔ اس کے گھر کی خواتین برقعہ پہن کر باہر نکلا کرتیں۔ اس کے رہنے کا محل ابھی موجود ہے جس میں اسلامیہ سکول قائم ہے۔ محل کے صحن میں سنگ مرمر کی ایک قبر ہے۔ اس کو شمالاً جنوباً کرنے کی کئی بار کوشش کی گئی مگر اگلی صبح پھر شرقاً غرباً ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں باوا گوربخش سنگھ بیدی فجر کے وقت قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی لاش کو جلایا نہ جائے۔ مگر خود سر سکھوں نے جلا دی۔ اس کے انتقال پر سات روز تک ماتم پرسی کے لئے علاقہ کے رؤسا اور بڑے بڑے انگریز افسر آتے رہے۔ ان دنوں کلر سیداں میں دور دور تک خیمے نصب رہے۔

کلر کے قریب ہی ایک جنگل باوا گوربخش سنگھ کی ذاتی ملکیت تھا جس میں وہ تیتر کا شکار کھیلا کرتا تھا۔

سید پور

سید پور خوبصورت مناظر باغات اور صاف پانی کے چشموں کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے جن میں سے چار چشمے رام کنڈ، سیتا کنڈ، لچھمن کنڈ اور ہنومان کنڈ کے نام سے مشہور ہیں۔ ہندوؤں

کے عقیدے کے مطابق شری رام چندر جی اپنے بن باس کے زمانے میں یہاں آکر رہے تھے۔ بیساکھی کے دنوں میں تقسیم سے پہلے ہندوان چشموں میں اشنان کے لئے جمع ہوا کرتے اور ایک میلہ لگا کرتا۔ اکبر اعظم جب گکھڑوں کے تنازعہ کا فیصلہ کرنے راولپنڈی آیا اور سواں کے کنارے کیمپ لگا کر چند روز ٹھہرا تو واپسی سے پہلے اس نے سید پور کی پہاڑیوں میں سردار سید خان کے ساتھ شیر کا شکار بھی کھیلا تھا۔ اسی شکار کے دوران سید خان کی بیٹی سے جہانگیر کے عقد کی بات طے پائی تھی۔

گوجر خان

تاریخی اعتبار سے گوجر خان کا علاقہ پنچال ریاست کا مرکز تھا اور ارجن کی رانی دروپدی اسی ریاست کی رہنے والی تھی، زمانہ مہابھارت کے آثار اب گوجر خان میں نہیں ملتے۔ انگریزی عہد میں بلکہ اس سے بھی پہلے تحصیل گوجر خان کی ساری تجارت کھتری ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ بیول، گلیانہ، سکھو، دولتالہ اور سید کسراں بھی تجارتی مرکز تھے۔ مگر یہ ساری تجارت گاہک اور آڑھتیوں کے باہمی مقامی لین دین پر مبنی تھی صرف گوجر خان ہی ایسا قصبہ تھا جہاں سے مال برآمد بھی کیا جاتا۔ چند آڑھتی ایسے بھی یہاں موجود تھے جن کا بیرونی ممالک سے رابطہ تھا۔ ایک دور میں گوجر خان کی منڈی سے انگلستان کو غلہ سپلائی کیا جاتا اور دس دس ہزار من گندم روزانہ برآمد ہوتی چنانچہ ریلی برادرز انگلینڈ نے اپنی ایجنسی یہاں کھول رکھی تھی۔

گوجر خان کے علاوہ تخت پڑی، بندا اور رلیسالی میں بھی منڈیاں تھیں مگر وہاں صرف مقامی دیہاتی خرید و فروخت کے لئے آتے جاتے۔ انہی تینوں قصبوں میں خچروں کی افزائش نسل اور فروخت کا خاصہ کاروبار تھا جو تمام تر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ خچر اس زمانے میں سرکاری ٹرانسپورٹ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے حکومت خود خریدا کرتی تھی۔

تحصیل گوجر خان میں تین چک ہیں۔

۱. چک پوٹھوہار
۲. چک جاتلی
۳. چک کھڈر

چک پوٹھوہار میں مندرہ گوجر خان اور گلیانہ ٹریک شامل ہے گلیانہ کے آس پاس پندرہ میل رقبہ کی زمینیں زرخیزی کے لحاظ سے علاقہ بھر میں اول نمبر قرار دی گئی ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے گلیانہ سے بڑا کوئی گاؤں پوٹھوہار میں نہیں ہے۔ گلیانہ پڑھے لکھے لوگوں کا مسکن ہے۔ ٹیچر یہاں سے بہت نکلے۔ گلیانہ کو ملک گل محمد گکھڑ نے آباد کیا تھا۔ چک جاتلی میں دلیوی اور دولتالہ شامل ہے۔
چک کھڈر میں بیول کا علاقہ شامل ہے۔

ذات قبیلے اور برادریاں

گکھڑ

گکھڑ پوٹھوہار کے قدیم حکمران ہیں ان کی اپنی روایت کے مطابق اُن کا سلسلہ نسب اصفہان کے اس شاہی کیانی خاندان سے جا ملتا ہے جس نے بدخشاں تبت اور کشمیر فتح کرنے کے بعد وہاں سولہ پشتوں تک حکمرانی کی۔ آخر کار اس خاندان کے ایک حکمران رُستم پر زوال آگیا اور اس کے بیٹے کابل شاہ نے سلطان سبکتگین کے دربار میں جا کر پناہ لی۔ کابل شاہ کا ایک بیٹا گکھڑ شاہ تھا جس نے اپنے اہلِ قبیلہ کے ساتھ ہندوستان پر ایک حملہ میں محمود غزنوی کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور محمود غزنوی سے اٹک اور جہلم کے مابین علاقہ کی حاکمیت کا پروانہ حاصل کر لیا۔

چینی سیاحوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اٹک تک یہ علاقہ مدتوں تاریخ کی روشنی سے دور رہا نویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک اس خطہ پر کشمیر کے راجاؤں کا تسلط رہا۔ اس کے بعد یہ علاقہ کابل کی ہندو شاہی کے زیر تسلط آگیا۔ یہ شاہی محمود غزنوی کے حملوں تک باقی تھی۔ لاہور کے جے پال اور انند پال اسی شاہی کا حصہ تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اسلام اس خطہ میں نمودار ہوا جس کے بعد گکھڑوں نے مارگلہ گھاٹی سے کھیری مورتی تک اپنا تسلط جما لیا۔ انہوں نے اس سارے علاقہ کو تین پرگنوں یعنی دانگلی پھروالہ اور راولپنڈی میں تقسیم کر رکھا تھا۔ البتہ بابر کی تزک سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائے اٹک اور بھیرہ کے مابین جاٹ اور گوجر وغیرہ قبیلے آباد تھے جو گکھڑوں کے ماتحت تھے۔

جے جی ڈمرک نے بھی اپنے مقالہ میں کشمیر پر گکھڑوں کے اجداد کے تسلط کا حوالہ تو دیا ہے البتہ اس نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس تسلط کا کوئی ثبوت "راج ترنگنی" سے نہیں ملتا جو کشمیر کے راجاؤں کی مستند تاریخ ہے۔

ڈمرک نے یہ بھی لکھا کہ بعض گکھڑ اس بات کے داعیہ دار ہیں کہ وہ نوشیروان عادل کے دُودمان ہیں۔

سرلیپل گرفن کا خیال ہے کہ گکھڑ خراسانی نژاد ہیں جو ۳۰۰ء کے لگ بھگ پنجاب میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

فرشتہ کا خیال ہے کہ پنجاب میں گکھڑ قبیلہ ۶۸۲ء میں آکر آباد ہوا۔ جنرل کننگھم کے خیال میں اباتر قبیلے کے ساکاؤں کی اولاد گکھڑ کہلائی جو ۵۰۰ء قبل مسیح میں دارا ہسٹپس کے حملوں کے دوران جہلم کے آس پاس آکر آباد ہو گئی۔ یا ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اس سے بھی پہلے کسی ساکا پارتھین" بادشاہ کے ساتھ یہاں آئے ہوں۔

وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گکھڑوں نے کب اسلام قبول کیا۔ تاریخ فرشتہ میں ان کے قبولِ اسلام کی کہانی تفصیل کے ساتھ درج ہے مگر میرے نزدیک فرشتہ عالمِ بالا کی خبریں لانا اور باؤنڈریاں لگاتا ہے۔ اُسے غالباً انگریز مصنفین کی طرح گکھڑ اور کھوکھر میں لفظی اشتباہ ہوا ہے۔ ورنہ یہ دونوں قومیں ایک نہیں ہیں۔

کھوکھر قبیلہ کے لوگ مسلمان فاتحین کی آمد سے پہلے میں لڑائی جھنگ اور شاہ پور وغیرہ اضلاع میں آباد تھے۔ اس کے برعکس ایرانی نژاد گکھڑ صرف اٹک ہزارہ راولپنڈی اور جہلم کے حکمران رہے۔

تیمور کے حملہ کے وقت کھوکھر لاہور پر قابض تھے۔ پنڈ دادن خان کو ایک کھوکھر سردار نے ہی اپنے نام پر بسایا تھا۔ گکھڑ سردار ملک قید خان اور اس کے بیٹے گل محمد خان نے بھی ۱۳۹۸ء میں تیمور سے ٹکر لی تھی۔ گل محمد خان نے ۱۴۳۶ء میں گلیانہ" کا موضع آباد کیا تھا۔ گلیانہ پوٹھوہار کا سب سے بڑا گاؤں ہے۔

گکھڑ اپنی عزتِ نفس کا بہت خیال رکھتے ہیں حال اُن کے شاندار ماضی کا غماز ہے نسلی تفاخر بھی ان میں بہت ہے۔ سادات کے علاوہ کسی دوسری قوم میں اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے اور

اپنے لئے بھی راجپوت سے کم کوئی رشتہ قبول نہیں کرتے۔

بعض گکھڑ راجہ اور مرزا بھی کہلاتے ہیں ۔ ادمال، سارنگ، فیروزال، بگیال، سکندریال ہتیال، گکھڑوں ہی کی شاخیں ہیں اور ان میں فخر و امتیاز کی جھلک نمایاں رہتی ہے۔ کسی کا خود کو مجرد گکھڑ کہہ دینا کافی نہیں۔ اس سے پوچھا جاتا ہے کیہڑا گکھڑ۔ سارنگ یا ادمال وغیرہ۔

سرڈینزل البٹسن نے رائے زادہ دُنی چند کی تحقیق کو اپناتے ہوئے لکھا ہے کہ گکھڑ اصفہان کے کیانی حکمران کیگوہر کی اولاد ہیں۔ اور انہوں نے کشمیر اور تبت فتح کرنے کے بعد پشتوں وہاں حکومت کی مگر آخر کار انہیں کابل کی طرف دھکیل دیا گیا اور پھر وہ گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں محمود غزنوی کے ساتھ پنجاب آئے۔

پوٹھوہار کی تاریخ اصل میں گکھڑوں ہی سے وابستہ ہے۔ انہوں نے ۱۰۲۱ء سے لے کر ۱۷۷۳ء تک یعنی ۷۵۲ برس اس خطہ پر حکومت کی۔ اگرچہ مغلوں کے عہد میں گکھڑ ان کے ماتحت تصور کئے جاتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مرکز کی مداخلت سے بے نیاز رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مغل شہنشاہ صرف ٹیکس کی وصولی پر قانع رہے اور انہیں کبھی مملکت کے اس حصہ پر اپنی مضبوط حکومت قائم کرنے کا خیال نہیں آیا۔

بابر کی آمد سے بہت پہلے گکھڑوں نے ۱۳۴۰ء میں محمد تغلق کے زمانے میں مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاہور تک علاقہ فتح کر لیا تھا۔ انہی دنوں ایک گکھڑ سردار بوگا خان نے علمِ بغاوت بلند کر کے وادی رہتاس میں اپنی بالادستی قائم کر لی۔ بوگیال گکھڑ اپنی نسبت بوگا خان ہی سے قائم کرتے ہیں اور رہتاس سے ڈومیلی تک کے علاقے میں بوگیال گکھڑ ہی آباد ہیں۔

۱۴۰۳ء میں جسرت خان گکھڑ نے کشمیر کے بادشاہ اللہ شاہ کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ مگر ۸ اکتوبر ۱۴۴۲ء کو لدھیانہ کے قریب شاہی لشکر نے اسے شکست فاش دے دی اور وہ راولپنڈی واپس آ گیا۔ کچھ مدت بعد اس نے جموں پر حملہ کیا اور راجہ رائے بھیم کو قتل کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ ۱۴۵۳ء اس کا سن وفات ہے۔

جسرت خان کے انتقال کے وقت اس کے دونوں بیٹے ابھی نابالغ تھے چنانچہ ایک جنجوعہ درویش خان نے ان سے اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لے لیا۔ ہاتی خان نے درویش خان کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور لبسال کی طرف بھاگ گیا لیکن اس کے دو بھتیجے سارنگ خان اور آدم خان وانگلی کی طرف آگئے۔ درویش خان ان کے تعاقب میں آیا۔ مگر اس دوران ہاتی خان نے اپنے قبیلے کی بھرپور مدد سے درویش خان کو زیر کر لیا۔ ہاتی خان کا کچھ اور احوال قلعہ پھروالہ کے باب میں درج کیا گیا ہے۔

سرحدی قبائل کی ایک بغاوت کے دوران گکھڑ سردار مراد قلی خان نے اٹک کے قریب ایک خونریز جھڑپ میں پٹھانوں کو شکست فاش دی اور دور تک بھگاتا لے گیا۔ بھگوڑے پٹھان اپنی توتلی زبان میں گکھڑ کے بجائے تکھڑ تکھڑ پکارتے دہائیاں دیتے بھاگتے چلے گئے۔

گکھڑوں کا تذکرہ گکھڑ خواتین کے بارے میں رائے زادہ دُنی چند کی رائے کے بغیر تشنہ رہے گا۔ اس لئے میں کیگوھر نامہ سے ایک اقتباس یہاں درج کرتا ہوں۔ "یہ خواتین شرم وحیا کے اوصاف رکھتی تھیں ان کی آنکھ قرآنِ مجید کے علاوہ کسی اور جانب اٹھتی ہی نہ تھی اور ذکر الٰہی ان کی زبانوں پر جاری رہتا تھا۔ ان کے کانوں میں اذان کے سوا کوئی کلمہ پڑتا ہی نہ تھا۔ جائے نماز کے علاوہ ان کے قدم کسی طرف اٹھتے ہی نہ تھے۔ وہ زمانے کی آنکھوں سے اس طرح نہاں تھیں جیسے روح جسم میں پوشیدہ رہتی ہے۔"

راجپوت

پوٹھوہار میں راجپوت خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ ان میں چوہان، گرندل، جنجال، جاتل اور جیٹھل شامل ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ان کے اجداد حضرت بابا فریدالدین مسعود

گنج شکر علیہ الرحمتہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ بغیال۔ بنگیال۔ بھکڑال۔ پنوار اور منگرال وغیرہ بھی راجپوتوں ہی کی شاخیں ہیں۔

گوجر

ان کی اصل کشان قبیلے سے ہے۔ پانچویں صدی عیسوی کے وسط تک جنوب مغربی راجپوتانہ میں گرجروں کی سلطنت کا پتہ چلتا ہے۔ زوال سلطنت کے بعد مختلف علاقوں میں سرگرداں رہے پھر پوٹھوہار میں گوجرخان جہلم اور حسن ابدال میں آباد ہو گئے۔ مسٹر سٹیڈمین لکھتا ہے کہ راولپنڈی کے گوجر اچھے کاشتکار ہیں۔

اعوان

قطب شاہ علوی غزنوی کی اولاد اعوان کہلاتی ہے۔ اول اول یہ لوگ ۱۰۳۵ء میں پشاور آکر آباد ہوئے۔ وہاں سے کوہستانِ نمک کا رخ کیا اور جنجوعوں کو شکست دے کر اقتدار پر قابض ہو گئے۔ ان کے سردار ملک کہلاتے ہیں۔ مسٹر تھامسن لکھتا ہے کہ اس قبیلے کے اطوار پسندیدہ ہیں تاہم دبنگ اور کینہ ور ہیں مگر جرائم پیشہ نہیں ہیں بلکہ محنتی کاشت کار اور زمیندار ہیں۔

جنجوعہ

جنجوعہ قبیلہ کے لوگ زیادہ تر جہلم کہوٹہ اور راولپنڈی کی تحصیلوں میں آباد ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب ان راٹھور راجپوتوں سے جا ملتا ہے جو جودھپور سے نقلِ مکانی کر کے کوہستان نمک کے علاقہ میں آباد ہو گئے ان دنوں راجہ مل ان کا سردار تھا۔ جیسا کہ تزکِ بابری سے معلوم ہوتا ہے۔ جنجوعے پہاڑی علاقے پر قابض تھے اور ان کی اکثریت کاشت کار تھی۔ جہلم کے بعض علاقوں

پر بھی ان کا اقتدار رہا۔ جب سلطان محمود غزنوی یہاں آیا تو کھوکھروں کی طرح جنجوعوں نے بھی مزاحمت کی لیکن شکست کھا کر جنگلوں کی طرف بھاگ گئے لیکن ان کا راجہ مل گرفتار ہو گیا اور اس نے اسلام قبول کر کے رہائی حاصل کی۔ اس کی تقلید میں دوسروں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اور گلے میں بندھے ہوئے جنجو اتار پھینکے۔ جنجو ہی جنجوعہ کی وجہ تسمیہ ہے۔ راجہ مل نے کلر کہار سے جنوب مشرق کی جانب ایک قلعہ بھی بنوایا تھا جسے قلعہ ملوٹ کہا جاتا ہے۔ اس کے آثار ابھی باقی ہیں۔

جنجوعوں اور گکھڑوں میں سخت عداوت بھی رہی۔ بابر کے حملے میں ان کی کمر ٹوٹ گئی تو اعوان اور گکھڑ ان پر غالب آ گئے۔ آگے چل کر جنجوعوں نے سکھوں کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ راجہ رنجیت سنگھ خود ان سے لڑنے آیا اور شکست دے کر کھیوڑہ کے نمک کی کانیں ان سے چھین لیں۔ یہ کانیں ان کا قیمتی سرمایہ تھیں جن سے محرومی کے بعد جنجوعے پائی پائی کو محتاج ہو گئے۔

کھڑوال جو تحصیل کہوٹہ میں آباد ہیں جنجوعوں ہی کی ایک شاخ ہیں۔

مسٹر کین نے سروے رپورٹ (۱۹۰۵) میں جنجوعوں کے بارے میں اچھے الفاظ استعمال نہیں کئے۔

کاہوٹ:

پنڈی کے ضلع میں کہیں کہیں آباد ہیں۔ یہ قریشی عربی کہلاتے ہیں۔ کہوٹہ کی وجہ تسمیہ یہی ہیں۔ اگرچہ اب کوئی کاہوٹ تحصیل کہوٹہ میں آباد نہیں۔

کھٹڑ:

سر لیپل گرفن کے خیال میں کھٹڑ خراسان سے مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ آئے تھے۔

اور اعوانوں سے کالا چٹا پہاڑ کے اطراف. کھیری مورتی اور پنڈی تحصیل کے کچھ حصوں میں آباد ہو گئے

مُغل :

مغل یا منگول بابر کے ساتھ پنجاب وارد ہوئے۔ راولپنڈی اور جہلم کے اضلاع میں بکثرت آباد ہیں۔ بعض ان میں سے کیانی اور بعض کامر کہلاتے ہیں۔

راول جوگی

راول عربی لفظ رَمّال کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ رَمل ریت کو کہتے ہیں اور رَمّال قسمت کا حال بتانے والے ہٹرڑ پوپ ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ کانوں کی میل نکالنا، آنکھوں کا علاج معالجہ، ٹھگ بازیاں اور نگر نگر گھوم پھر کر بھیک مانگنا ہے۔

پوٹھوہار میں اب شاید ہی کوئی راول رہتا ہوگا۔ البتہ راولپنڈی کی وجہ تسمیہ یہی لوگ ھیں۔ ہندی میں راول کا مطلب ہے سورما۔

جہانگیر تُوزک (جلد اول ص۱۹) میں لکھتا ہے کہ راولپنڈی کو راول نامی ایک ہندو نے آباد کیا تھا۔ پنڈ گکھڑوں کی زبان میں گاؤں کو کہتے ہیں۔"

انگریزی عہد میں راول لوگ شہر سے نکل کر راول نامی گاؤں میں جا کر آباد ہو گئے اور پھر وہاں سے بھی نقل مکانی کر کے گورداسپور چلے گئے۔

کرال :

قبیلہ کرال تحصیل ایبٹ آباد کے موضع ناڑا میں آباد تھا۔ یہ علاقہ گکھڑوں کے ماتحت تھا۔ یہ لوگ ہندو مذہب کے پیرو تھے۔ شائد تین سو برس پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا۔ میجر ولس لکھتا ہے۔

کہ یہ لوگ سادہ بود و باش رکھتے ہیں۔ محنت سے زمینیں کاشت کرتے ہیں مگر دلاور نہیں۔ بعض کرال اپنے مورثِ اعلیٰ کو سکندر اعظم کا جانشین بتاتے ہیں۔

نیازی:

کیمبل پور کے اطراف میں چند نیازی خاندان آج بھی موجود ہیں۔ تاہم پوٹھوہار میں انہیں کوئی مستقل مقام حاصل نہیں۔ شیر شاہ سوری کے بیٹے اسلام شاہ کے عہد میں نیازیوں نے پنجاب اور ملتان میں اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ ان دنوں اعظم اس قبیلے کا سردار تھا۔ شیر شاہ سوری نے ہی اسے ملتان کا گورنر مقرر کیا تھا مگر اس نے ذاتی اقتدار کے لئے تگ و دو شروع کر دی کیونکہ وہ مغل بادشاہ ہمایوں کا طرف دار تھا۔ شیر شاہ اسے معزول کرنے کی فکر میں تھا کہ انتقال کر گیا۔ اسلام شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے اس کی برطرفی کا حکم بھیجا مگر اعظم نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

اب اسلام شاہ نے اس کے خلاف فوج کشی کا منصوبہ بنایا۔ اعظم نے بھی مقابلے کی تیاری کر لی۔ اور ملتان سے روانہ ہوا۔ انبالہ کے قریب بڑے زور کا مقابلہ ہوا لیکن اس کے ساتھی خواص خان اور عیسیٰ خان اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اعظم بڑی بے جگری سے لڑا مگر ناکام ہو گیا اور اپنے بچے کھچے سپاہیوں کو لے کر گکھڑوں کی پناہ میں آ گیا۔

ان دنوں قلعہ رہتاس کا نگران خواجہ اویس سروانی تھا۔ قلعہ میں ساز و سامان اور فوجی طاقت بھی موجود تھی۔ تاہم اعظم نے اسے شکست دے دی مگر لاہور کے گورنر شمس خان لوہانی نے تازہ کمک بھیج دی جس کے آتے ہی نقشہ بدل گیا۔ نیازی بری طرح پٹ کر منتشر ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۵۴۹ء کا ہے

اعظم کشمیر کی طرف بھاگ گیا اور کشمیر کے حاکم مرزا حیدر کے یہاں پناہ لینے کی کوشش کی مگر اس

نے اعظم کو قتل کر کے اس کا سر اسلام شاہ کے پاس گوالیار بھیج دیا۔ اس طرح نیازی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔
تاہم تاریخ شاہد ہے کہ اسلام شاہ نیازیوں سے اتنا خوف زدہ تھا کہ اس نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے مان کوٹ (ضلع سیالکوٹ) میں پانچ قلعے تعمیر کرائے تھے۔

بھٹی:

زیادہ تر تحصیل گوجر خان میں آباد ہیں۔ سر ڈینزل اپسٹن لکھتا ہے کہ بھٹی قبیلہ قبل مسیح کسی زمانے میں کشمیر اور کوہستان نمک کے علاقے پر قابض تھا اور موجودہ راولپنڈی ان کا صدر مقام تھا لیکن دوسری صدی قبل مسیح میں ان کو "ساکاؤں" نے یہاں سے باہر دھکیل دیا۔ اس وقت ان کا حکمران راجہ رسالو تھا جس نے بعد ازاں سیالکوٹ آباد کیا۔ ساکا فاتحوں نے انہیں وہاں بھی ٹکنے نہ دیا اور آگے ہنکاتے لے گئے۔ حتیٰ کہ یہ لوگ ستلج کے جنوب میں جا کر آباد ہوئے۔
آج بھی کوہستان نمک، گجرات، سیالکوٹ میں بھٹی کافی تعداد میں آباد ہیں اور خود کو سرسہ کے علاقہ بھٹنیر کا رہنے والا بتاتے ہیں۔

دھمیال

راولپنڈی کے گردونواح میں آباد ہیں۔ ان کی جنم بھومی غزنی ہے۔ وہاں سے سیالکوٹ آئے جہاں سے منتقل مکانی کر کے جہلم کے قریب موضع "دھمیک" کو بسایا اور ایک قلعہ بھی تعمیر کیا۔

قدیم قلعے اور فنِ تعمیر

محمود غزنوی اور پھر شہاب الدین محمد غوری کے حملوں سے برصغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کا آفتاب طلوع ہوا۔ افغان اور مغل دور کے اواخر تک اگرچہ مسلمانوں کا پایۂ تخت دہلی یا آگرہ رہا۔ تاہم ان کے مقرر کردہ گورنر دوسرے صوبوں میں نظم ونسق سنبھالے رہے مگر مرکز کے ان نامزد گورنروں کی حیثیت، جہاں تک خطۂ "پوٹھوہار" کا تعلق ہے، برائے نام سی تھی۔ اصل قوت مقامی گکھڑ سرداروں ہی کے ہاتھ میں رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ مرکز سے دوری کے باعث "ٹکسال باہر" کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ بھی کہ گکھڑ سردار کب کسی کے مالکانہ جبر وتسلط کو ماننے والے تھے۔ عہد مغلیہ میں گکھڑوں کا اثر ورسوخ بہت بڑھ گیا تھا اور بابر سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک انہیں شاہی مزاج میں خاصہ دخل رہا۔ پانی پت کے میدان میں گکھڑ سردار سارنگ خان اور آدم خان بابر کی کمان میں لودھیوں کے خلاف لڑے۔ ہمایوں کی واپسی گکھڑ سردار آدم خان کی مرہونِ منت ہے اور تاج وتخت کے حصول میں امداد دینے پر انہیں بہت کچھ نوازا بھی گیا تھا۔ اکبر اعظم کے عہد میں ایک گکھڑ جرنیل مرزا جلال خان، مغل فوج میں موجود تھا۔ امیر خان فیروزل کو اورنگ زیب نے "چوہدری" کے لقب سے نوازا تھا۔

تاہم مغل فرمانروائی کے دور میں پوٹھوہار کے اندر ایسے قابلِ ذکر واقعات رونما نہیں ہوئے

جنہیں میں الگ باب میں قلم بند کرتا اور جو واقعات یا سیاسی حالات قابل ذکر ہیں ان کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی قلعہ شامل ہے اس لئے میں نے اس باب کو قدیم قلعوں کی روداد کے لئے مختص کیا ہے۔

پوٹھوہار میں بہت قدیم سے قلعے تعمیر ہوتے رہے۔ ان کی اہمیت علاقائی اور جغرافیائی ہے کیونکہ یہ علاقہ بیرونی حملہ آوروں کی گذرگاہ رہا ہے۔ ان بے شمار قلعوں میں سے جو نام میں معلوم کرسکا ہوں ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ قلعہ نندنہ (باغاں والا)

۲۔ قلعہ ناڑا۔

۳۔ قلعہ کوٹ (پورا نام معلوم نہیں، محل وقوع: دو میل شمال از ملک پور)

۴۔ قلعہ گرجاکھ۔

۵۔ قلعہ گسک۔

۶۔ قلعہ کھولا۔

۷۔ قلعہ کٹاس۔

۸۔ قلعہ ڈنڈوت۔

۹۔ قلعہ کوٹ کلیبی (موجودہ نام گاہی)

۱۰۔ قلعہ ملوٹ۔

۱۱۔ قلعہ کھنکا۔

۱۲۔ قلعہ بادشاہ پور (یہ قلعہ نہیں صرف بابر نے یہاں قیام کیا تھا)

۱۳۔ قلعہ نلی۔

۱۴۔ قلعہ پیل۔

۱۵۔ قلعہ دھولر۔

۱۶۔ قلعہ شادیہ

۱۷۔ قلعہ کھوڑا کھتوائی

۱۸۔ قلعہ کانڈے والا (نزد پنڈدادن خان)

۱۹۔ قلعہ پھروالہ۔

۲۰۔ قلعہ روات۔

۲۱۔ قلعہ دانگلی۔

۲۲۔ قلعہ رہتاس۔

۲۳۔ قلعہ سلطان پور۔

ان قلعوں میں تین چار قلعے یعنی پھروالہ، روات، سلطان پور، دانگلی، رہتاس، بہت بڑے تھے ان کے کھنڈر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں قلعوں کے دروازے بہت اونچے رکھے جاتے تھے کیونکہ ان سے ہاتھیوں کو گذارنا ہوتا تھا۔ ہاتھی جنگی ضرورتوں کے علاوہ باربرداری اور سفر کے بھی استعمال میں لائے جاتے تھے۔ اگر غنیم حملہ کر کے کسی شہر پر قبضہ کر لیتا تو شہری آبادی قلعہ میں منتقل ہو کر مقابلہ کرتی۔ اس لئے قلعے مضبوط سے مضبوط تر بنوائے جاتے۔ دیواریں بلند رکھی جاتیں اور ان میں تیراندازی کی خاطر موکھ یا سوراخ رکھے جاتے۔ قلعہ کے محافظ دستوں کے رہائشی مکان صدر دروازے کے بالکل سامنے ہوا کرتے۔

نوٹ:۔ "قلعوں کے علاوہ گکھڑوں کے عہد میں مسجدیں بھی تعمیر ہوئیں گکھڑوں کے عہد میں ترکی کے علاقہ میں اعلیٰ سنگ تراش موجود تھے۔ موضع جنڈالہ کی قدیم جامعہ مسجد انہی کی کاریگری کا شاہکار ہے اس مسجد کے معمار نے اعلان کیا تھا کہ کوئی شخص اگر میرے بنائے ہوئے مینار کا جوڑ بتادے تو انعام دوں گا۔ ابھی یہ مینار اور مسجد موجود ہے۔ جوڑ کہیں نظر نہیں آتا۔"

قلعوں کے علاوہ سرائے 'بنہ' پانی کے سر. باؤلیاں بھی گکھڑوں کے عہد میں تعمیر ہوئیں.

قلعہ پھروالہ:

پھروالہ تحصیل کہوٹہ میں ہے جو گکھڑوں کا صدر مقام تھا (بابر نے اپنی توزک میں پھروالہ کو پرہالہ لکھا ہے) یہاں سلطان کیگوہر عرف گکھڑ شاہ نے ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا. جو ۱۰۰۸ء سے ۱۰۱۲ء کے درمیانی عرصہ میں مکمل ہوا.

۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی نے حملہ کیا تھا. پوٹھوہار پر ان دنوں لاہور کے پال راجاؤں کی حکومت تھی. تاریخ تیقن کے ساتھ یہ تعین کرنے سے بھی قاصر ہے کہ گکھڑ سپاہی سلطان محمود کے ساتھ آئے. یا وہ یہاں مدتِ دراز سے آباد تھے اور انہوں نے آنند پال کی معاونت میں محمود غزنوی سے لڑائی مول تھی.

مورخین پہلی روایت کو ترجیح دیتے ہیں کہ گکھڑ قبیلے کے لوگ محمود غزنوی کے لشکر کے ساتھ آئے تھے اور محمود نے دریائے جہلم اور اٹک کے مابین علاقہ انہیں بطور جاگیر عطا کر دیا تھا. لیکن یہاں ایک گھپلا ہوجاتا ہے کہ بعض حلقوں کے خیال میں اس جاگیر کا پروانہ محمود غزنوی نے راولپنڈی (جسے ان دنوں گجنی پور کہا جاتا تھا) میں بیٹھ کر لکھا اور گکھڑ شاہ کو پھروالہ بھیجا تھا. اس روایت کے مطابق گکھڑ گویا یہاں بہت پہلے سے موجود تھے اور پھروالہ ان کا مرکز تھا. اس سلسلے میں لطیفہ کی بات یہ بھی ہے کہ جس نقلی وثیقہ کی رو سے پوٹھوہار بطور جاگیر گکھڑوں کو بخشا گیا تھا اسے 'تیار' کرتے وقت تھوڑی سی عجلت ہو گئی اور اس میں 'مابینِ اٹک و جہلم' لکھا گیا حالانکہ اس زمانے تک دریائے سندھ کو 'اٹک' نہیں بلکہ نیل آب کہا جاتا تھا اور جہلم کو 'وبت' کہتے تھے. اور اس وثیقہ کی زبان بھی خاصی ناقص ہے. بہرکیف اس وثیقے کے 'مصنفینِ حال' کو اصرار ہے کہ ان کے اجداد کو محمود غزنوی نے یہی تحریر دی تھی. واللہ اعلم.

پھروالہ کا قلعہ اڑھائی میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ قلعہ کے شمال میں اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں جنوب کی سمت گہرے کھڈ ہیں۔ ایک جانب قلعہ کی دیواروں کے نیچے دریائے سواں بہتا ہے۔ یہ کھڈ پہاڑیاں اور دریا قلعہ کے لئے قدرتی دفاع کا کام دیتے رہے اس طرح عسکری نقطۂ نظر سے اس قلعہ کی تعمیر کے لئے پھروالہ کے مقام کا انتخاب غلط نہ تھا۔

قلعہ میں چھ دروازے ہیں۔ دیواریں تیس فٹ بلند اور بیس فٹ چوڑی ہیں۔ دیواروں میں غنیم پر تیر چلانے اور بندوق داغنے کے لئے جگہ جگہ روزن موجود ہیں۔ نقار خانہ والے حصہ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سپاہیوں کے رہائشی مکانات بھی ہوں گے۔ اس قلعہ کی فوجی اہمیت بہرحال عیاں ہے۔ تاہم اسے فنِ تعمیر کا کوئی بلند پایہ نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔

۱۵۱۹ء میں بابر کے حملہ کے وقت جیسا کہ تزک بابری ص ۲۷۶ سے معلوم ہوتا ہے گکھڑوں کی سلطنت نیلاب اور بھیرہ کے درمیانی سلسلۂ کوہ تک تھی۔ گکھڑوں کے علاوہ جودہ، جنجوعہ، جٹ اور گجور وغیرہ قومیں بھی یہاں آباد تھیں اور انہوں نے ہر پشتے اور درّے میں گاؤں بسا لئے تھے۔ یہ علاقہ دو حصوں میں منقسم تھا ایک پر تاتار گکھڑ اور دوسرے پر ہاتی گکھڑ حکمران تھا۔ ہاتی گکھڑ کا اصل نام محمد خان تھا۔ یہ دونوں چچا، بھتیجا تھے۔ تاتار گکھڑ کا صدر مقام پھروالہ تھا۔ اور کوہستانی علاقہ پر ہاتی گکھڑ حکمران تھا۔ وہ تاتار خان کے بھائی ملک پلیو کا بیٹا تھا۔

جن دنوں بابر دریائے سواں سے گزر کر بھیرہ کی طرف گیا۔ ہاتی نے تاتار کو قتل کر کے اس کا ملک بھی ہتھیا لیا۔ تاتار کے داماد منوچہر نے بابر کو اس واقعہ کی خبر پہنچائی اور جنجوعہ سرداروں نے بھی ہاتی کی شکایت کی کہ بڑا خود سر آدمی ہے۔ مسافروں کو لوٹ لیتا ہے وغیرہ وغیرہ چنانچہ بابر نے اس کی گوشمالی ضروری سمجھی

بابر کا لشکر رات کے وقت بھیرہ سے روانہ ہوا اور اگلے روز چاشت کے ہنگام پھروالہ

پہنچ کر دم لیا۔ صفیں آراستہ ہوئیں اور بابر نے ایک دستہ کو بھروالہ شہر کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ ہاتی نے تیس چالیس سواروں کی مدد سے اس دستہ کو پسپا کر دیا۔ اتنے میں بابر نے کمک بھیج دی اور سخت لڑائی ہوئی جس میں ہاتی کے چھکے چھوٹ گئے اور اسکی فوج نے میدان سے بھاگ کر شہر کے اندر مورچے سنبھال لئے۔ بابر کے سپاہیوں نے تعاقب کیا۔ ہاتی بمشکل جان بچا کر شہر کے مغربی دروازہ سے باہر نکل گیا۔

بابر کی فتح کا ڈنکا بج گیا اور وہ بھروالہ کے اندر داخل ہوا اور تاتار کے رہائشی محل میں فروکش ہوا۔ یہ واقعہ ۱۵ مارچ ۱۵۱۹ء کو ہوا تھا۔

جب بابر بھروالہ سے روانہ ہو کر سواں کے کنارے اندرانہ پہنچا تو ہاتی خان نے ایک ایلچی جس کا نام پربت تھا بابر کی خدمت کی میں تحفے تحائف دے کر بھیجا اور صلح کی درخواست کی۔ بابر نے ایلچی کو خلعت عطا کی۔ ہاتی کا قصور معاف کر کے امن کا پروانہ لکھا اور ملک و مال اس کو واپس کیا اور "سلطان" کے لقب سے نوازا۔

اسی مرحلہ سے گکھڑوں اور مغلوں کے درمیان ان روابط کا آغاز ہوا جو چند ایک باغیانہ سرگرمیوں کو چھوڑ کر مغلوں کے آخر دور تک برابر قائم رہے۔

۱۵۲۵ء میں ہاتی کے انتقال پر سارنگ خان حاکم بنا۔ سارنگ خان اور اس کا بھائی آدم خان بابر کے مطیع رہے اور گکھڑوں کی ایک جمعیت کے ساتھ اسے دہلی جا کر ملے اس موقع پر بابر نے سندھ اور چناب کے درمیانی علاقہ پر ان کے تسلط کی توثیق کی تھی۔

اس واقعہ سے ایک برس بعد ۱۵۲۶ء میں جب بابر نے ابراہیم لودھی پر یورش کی تو پانی پت کے میدان میں آدم خان گکھڑ کے بارہ ہزار سپاہی مغلوں کے دوش بدوش لڑے۔ اس فتح کے بعد سلطان آدم خان اور سلطان سارنگ کو پوٹھوہار کی دائمی باگ ڈور سپرد کی گئی اور انہی دنوں گکھڑ سرداروں نے بھروالہ کی جگہ دانگلی کو اپنا صدر مقام بنایا۔

جولائی ۱۵۵۳ء میں ہمایوں کا باغی بھائی کامران گکھڑوں کے پاس پناہ لینے کو پہنچا۔ سلطان آدم خان نے اس کو اپنے یہاں مہمان کیا۔ مگر ہمایوں کو اطلاع کر دی۔ اگست یا ستمبر ۱۵۵۳ء میں ہمایوں پھروالہ پہنچا۔ گفت و شنید کے بعد سلطان آدم خان نے مرزا کامران کو اس شرط پر ہمایوں کے حوالے کیا کہ اسے جان سے نہیں مارا جائے گا۔

مگر ہمایوں کے امرا کہتے تھے کہ کامران کی خوئے بغاوت کو بدلنا ممکن ہی نہیں اس لئے اس کو جان سے مار ڈالنا ہی مناسب ہے۔ امرا کا اصرار بڑھا تو ہمایوں نے کہا اچھا مجھے لکھ کر دو۔ تمام امرا نے متفقہ طور پر یہ مصرعہ لکھ کر حوالے کیا ؏

رخنہ گرِ ملک سر افگندہ بہ

"یعنی ملک میں رخنہ ڈالنے والے کا سر قلم کرنا ہی بہتر ہے"۔

بہرکیف ہمایوں چونکہ آدم خان سے کامران کی جان بخشی کا وعدہ کر چکا تھا۔ اس لئے کامران کو قتل تو نہیں کرایا گیا البتہ اس کی آنکھوں میں نشتر گھونپنے کا حکم دے دیا۔

یہ نومبر یا دسمبر ۱۵۵۳ء کے دن اور رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔

(اگرچہ ایشوری پرشاد لکھتا ہے کہ یہ واقعہ اکتوبر ۱۵۵۲ء سے کچھ پہلے کا ہے)

پھروالہ کے قلعہ میں علی دوست باربیگی نے فوری طور پر حکم کی تعمیل کی۔ کامران کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور فراش کی مدد سے اسے زمین پر لٹا کر اس کی آنکھوں میں نشتر گھونپ دیا اور اس عمل کو پچاس مرتبہ دہرایا۔ اس موقع پر باربیگی کے علاوہ سید محمد پکنہ، غلام علی شش انگشت اور جوہر موجود تھے۔ جوہر کا کہنا ہے کہ کامران نے بڑی جرات مندی سے اس اذیت کو برداشت کیا اور ہلکی سی چیخ بھی اس کے منہ سے نہیں نکلی۔ لیکن جب زخمی آنکھوں میں نمک پاشی کے بعد لیموں کا رس ٹپکایا گیا تو بے محابا چیخیں نکل گیئں اور اس نے بارگاہ ایزدی میں فریاد کی! اے اللہ میرے گناہوں کی خاصی سزا مجھے مل گئی اب روزِ محشر مجھ پر کرم کیجو ــــ"

آنکھوں سے محرومی کے بعد مرزا کامران نے ہمایوں سے حج پر جانے کی اجازت چاہی اور سندھ کے راستے عازم حجاز ہوا۔ اس سفر میں اس کی اہلیہ ماہ چوچک بیگم، ہلمہ بیگ اور بیگ ملوک اس کے ہمراہ گئے۔ کامران نے تین مرتبہ حج کی سعادت پائی اور ۵ اراکتوبر ۱۵۵۷ء کو مکہ مکرمہ میں اس کا انتقال ہوا۔

جیساکہ پہلے لکھا گیا ان دنوں گکھڑوں نے پھروالہ کی جگہ دانگلی کو اپنا مرکز بنالیا تھا، روات کے قریب شیر شاہ کے بیٹے اسلام شاہ کے ہاتھوں شکست اور سلطان سارنگ کی موت کے بعد اس کے بھائی سلطان آدم خان نے قلعہ پھروالہ کو از سر نو سامانِ حرب وضرب سے آراستہ کیا، لشکر ترتیب دیا اور بدلہ لینے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ شیر شاہ کے جانشین بودے اور کمزور نکلے۔ چنانچہ ودھار کے مقام پر ایک جھڑپ میں افغانوں کا لشکر گکھڑوں سے مات کھا گیا۔

۱۵۵۴ء میں سلطان آدم خان نے ہی ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے اخلاف کی فوجی طاقت کے انتشار کا حال لکھ کر بھیجا اور ہلہ بولنے کی دعوت دی۔ پھر جب ہمایوں آگیا تو اس کو باضابطہ مدد دے کر مغلیہ سلطنت کے دوبارہ قیام کی راہ ہموار کی۔

اکبر اعظم کے عہدِ حکومت کا واقعہ ہے کہ ۱۵۶۳ء میں آدم خان اور سارنگ خان کے بیٹوں میں تنازعہ ہوا۔ اس کا باعث سارنگ کے بیٹے علاول خان کی بیوی تھی جس پر آدم خان کا بیٹا لشکر خان عاشق ہوگیا تھا اور اسی مستی میں علاول خان کو قتل کرا دیا۔ علاول خان کا بھائی کمال خان ان دنوں دارالخلافہ گیا ہوا تھا۔ اسے وہیں اس واقعہ کی اطلاع ملی۔ اس نے شہنشاہ اکبر سے آدم خان کی معزولی کا حکم لکھوالیا۔ اور وطن آکر لشکر خان کو ایک جھڑپ میں شکست دے کر قتل کر دیا۔ لیکن کمال خان کو بھی بہت دنوں جینا نصیب نہ ہوا۔ اس کے انتقال پر گکھڑوں کی مملکت میں افراتفری

پھیل گئی۔ اکبر اعظم کو اس موقع پر یہاں آنا پڑا۔ رہتاس کے قلعہ میں قیام کیا اور آخرکار پوٹھوہار کے علاقہ کو متحارب گکھڑوں میں اس طرح تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا

۱۔ آدم خان کے پوتے جلال خان کو رہتاس، سلطان پور اور موضع دانگلی اور ۴۵۳ گاؤں دیئے گئے۔

۲۔ کمال خان کے بیٹے مبارز خان کو پھروالہ کا پرگنہ اور ۳۳۳ گاؤں دیئے۔

۳۔ سارنگ خان کے بیٹے سید خان کو راولپنڈی کا حاکم بنایا۔

۴۔ آدم خان کے ایک اور بیٹے شیخ گنگا کو تخت پڑی کا علاقہ اور ۲۴۲ گاؤں عطا فرمائے۔

تخت پڑی کو ان دنوں اکبر آباد کہتے تھے۔ ایک برس بعد مبارز خان کی موت پر پھروالہ کا پرگنہ بھی جلال خان کو مل گیا۔ جلال خان ایک جیالا گکھڑ تھا۔ اس نے شاہی افواج کی کمان کرتے ہوئے کرناٹ، بنوں اور یوسف زئی قبیلے کے ساتھ جنگیں لڑیں۔ ۱۶۱۱ء میں لمبی عمر پاکر فوت ہوا۔ وہ مغلوں کی شمالی افواج کا سالار تھا۔

اصل میں مبارز خان کی موت کے بعد اس کے بیٹے اجمیر خان اور پھر شادمان خان کو قلعہ پھروالہ کی جاگیر ملی تھی۔ شادمان خان اورنگ زیب کا درباری شاعر تھا۔ اس نے بادکش اور چھج باندھ کر اڑنے کی کوشش کی۔ پرواز اگرچہ کامیاب تھی تاہم اترتے وقت دریائے سواں کے کنارے سے ٹکرانے کے باعث شادمان خان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بادشاہ نے اسے فاتر العقل قرار دے کر معزول کر دیا۔ اور پھروالہ کا پرگنہ بھی جلال خان کے حوالے کر دیا۔ تاریخی اعتبار سے شادمان خان دنیا کا پہلا ہوا باز ہے جس نے سترہویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں فضائی پرواز کی کوشش کی تھی۔

مغلوں اور گکھڑوں کے تذکرہ میں ایک بات ان کے باہمی تعلقات میں خوشگواری ہے دو گکھڑ خواتین مغل شہزادوں سے بیاہی بھی گئیں۔ ایک سلطان سارنگ کی پوتی تھی جو جہانگیر کے عقد میں آئی جس سے عفت بانو بیگم پیدا ہوئی جو تین برس کی ہو کر مر گئی۔ اللہ قلی خان کی بیٹی

اورنگ زیب کے چوتھے بیٹے شہزادہ اکبر کے ساتھ بیاہی گئی۔

مغلوں کے زوال کے بعد گکھڑوں کی طاقت بھی کمزور پڑ گئی کیونکہ وہ آپس میں بھی الجھنے لگ گئے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے اقتدار کا چراغ اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف اول تک گل نہ ہو سکا۔

مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی مرہٹوں نے دہلی اور گرد و نواح میں فتنے کھڑے کر دیئے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مسلمان بادشاہوں کو دعوت جہاد دی۔ جس کے جواب میں احمد شاہ ابدالی نے سلطان مقرب خان کی امداد سے متھرا اور پانی پت کی تیسری جنگ میں کارہائے نمایاں کر دکھائے۔

احمد شاہ ابدالی نے سلطان مقرب خان کو "نواب" کے خطاب سے نوازا اور کہا! "درمیان اٹک و جہلم شد مقرب بادشاہ"۔ اس گکھڑ سلطان نے اپنی سرحدوں کو اٹک سے گکھڑ منڈی تک پھیلایا۔ آخر کار سکھوں کی مسلسل یورشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جنگ گجرات میں اسے اپنے ہی قبیلہ کے ایک شخص ہمت خان نے جو سکھوں سے مل گیا تھا شہید کر دیا۔ اس کی شہادت کی تاریخ شاہ مراد نے سعدی کے ایک مصرعہ سے نکالی۔ "یونس اندر دہانِ ماہی شد۔"

سلطان مقرب خان کی شہادت کے بعد سکھوں نے پھروالہ کی طرف پیش قدمی کر کے قلعہ کی عمارت کو سخت نقصان پہنچایا۔ بہت سے گکھڑ سرداروں کو جن میں مدد خان اور شادمان خان شامل تھے گرفتار کر کے جموں کے قریب ریاسی میں نظر بند کر دیا۔ یہ خاندان ۱۸۴۸ء میں ایبٹ صاحب نے آزاد کرایا اور ان کے سردار حیات اللہ خان کو جو شادمان خان کا بیٹا تھا چند مضافات اور کچھ پنشن دلوائی۔ حیات اللہ خان کا بیٹا کرم داد خان پوٹھوہار کا نامور فرزند گزرا ہے۔ اس نے وہ تمام جاگیریں جو انگریزوں نے دی تھیں، تحریک خلافت میں واپس کر دیں۔

راجہ حسن اختر مرحوم آئی سی ایس کرم داد خان کے بیٹے تھے۔ حکیم الامت علامہ اقبال کو ان سے بڑی خصوصیت تھی۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا اور پاکستان قومی اسمبلی کے بھی ممبر رہے اور پاکستان مسلم لیگ کے صدر بھی۔ ۱۹۶۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

قلعہ روات:

روات کا قلعہ راولپنڈی سے گیارہ میل دور شاہراہ اعظم پر واقع ہے قلعوں کی روایتی جسامت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو ہم قلعہ سے زیادہ دیکھ بھال کی ایک اہم چوکی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کے صرف دو دروازے ہیں ایک جو مشرق کی سمت کھلتا ہے۔ دوسرا مغرب کی طرف۔

اس کو قدرے بلندی پر تعمیر کیا گیا تھا تاکہ آس پاس کی آبادی پر نظر رکھی جا سکے۔ علاوہ ازیں ملک کے مختلف حصوں کو ڈاک لے جانے والے ہرکارے اس چوکی پر گھوڑے بدلنے کے لئے ٹھہرا کرتے اس کی دیواریں تیس فٹ بلند رکھی گئی تھیں اور اس میں فوجیوں کے لئے چند رہائشی مکانات بھی بنوائے گئے اور ایک مسجد بھی۔ درمیان میں خوبصورت اور کشادہ اسلامی طرز کا دیوان خانہ بھی ہے۔

روات کا لفظ غلط العوام ہے۔ اصل میں یہ رباط تھا اور رباط چار دیواری میں محصور اور محفوظ مقام کو کہتے ہیں۔

گکھڑ سلطان سارنگ کی قبر اسی قلعہ میں شمال مغربی کنارے پر موجود ہے۔ ۱۵۴۵ء میں شیر شاہ سوری کے بیٹے اسلام شاہ نے گکھڑوں کو تادیب کرنے کے لئے پوٹھوہار پر چڑھائی کی اور سلطان پور کے قریب گکھڑوں کو بھاری جانی نقصان پہنچایا اور پھر روات میں فیصلہ کن جنگ کر کے ان کی قوت کو بہت نقصان پہنچایا۔ سلطان سارنگ اور اس کے سولہ بیٹے جنگ میں مارے گئے۔ سلطان سارنگ کے بھائی آدم خان نے اپنے بھائی اور بھتیجوں کو دفن کیا اور افغانوں کے

خلاف گوریلا جنگ شروع کر دی۔ اسی دوران اس نے یہ قلعہ بھی تعمیر کرایا مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قلعہ مغلوں نے بنوایا تھا اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ اس کی تعمیر میں مغل فنِ تعمیر جھلکتا ہے۔

تعمیر کی تاریخ یہ ہے۔

بہ تاریخ ہجری گذشت است سال
بہ نو صد چہل ہشت آمد جلال

اس زمانے میں مغل فنِ تعمیر ہی رائج تھا جس کی وجہ سے اشتباہ ہوا کہ یہ قلعہ مغلوں نے بنوایا تھا اس پر ایک مرتبہ جھگڑا بھی ہو چکا ہے۔ مغل کہتے ہیں کہ ٹیکسلا کے قریب مغلوں کی تعمیر کردہ ایک سرائے میں جو مسالہ استعمال ہوا وہی روات کے قلعہ میں بھی نظر آتا ہے اس لئے یہ قلعہ ہمارے اسلاف نے بنوایا تھا۔ مگر یہ محض مفروضہ ہے اس کی بنیاد آدم خان نے ہی رکھی تھی اور یہ گکھڑوں ہی کی یادگار ہے۔

آج کل روات میں چند گھر گکھڑوں کے ہیں باقی ساری آبادی مغلوں اور اعوانوں کی ہے۔

قلعہ رُہتاس:

یہ قلعہ خطۂ پوٹھوہار کی قدیم عسکری تعمیر کا شاہکار ہے اسے شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا اس نے ۱۵۳۹ء میں معزولی بہار کے ہندو راجہ کو شکست دے کر اقتدار حاصل کیا اور پھر ۱۵۴۱ء میں ہمایوں سے بھی تاج و تخت چھین کر ایران کی طرف ہجرت پر مجبور کر دیا۔ مگر بات یہاں ختم نہیں ہوگئی۔ بلکہ اسے ہمیشہ خدشہ رہا کہ ہمایوں اپنے کھوئے اقتدار کو بحال کرنے کی ضرور کوشش کرے گا اور پوٹھوہار کے گکھڑ اس کی مدد کریں گے۔ گکھڑوں نے سرکاری قافلوں کی آمد و رفت میں بھی دشواریاں کھڑی کر دی تھیں اور شیر شاہ کے لئے اس علاقہ سے تازہ بھرتی بند ہونے کا مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے جہلم سے بارہ میل شمال مغرب کی جانب ایک قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا جسے قلعہ رہتاس

کا نام دیا۔ جس معمار کی نگرانی میں یہ قلعہ تعمیر ہوا اس کا نام شاہو سلطانی ہے۔

رہتاس کا قلعہ شاہراہِ اعظم سے ساڑھے چار میل ہٹ کر دینہ کے جنوب میں واقع ہے پہلے شاہراہ اعظم اس کے برابر سے گزرتی تھی۔ بعد ازاں اسے چند میل پرے ہٹا دیا گیا۔ پرانی شاہراہ کے نشانات قلعہ سے میل بھر دور ایک ویران مغل سرائے کے قریب دیکھے جا سکتے ہیں

رہتاس ان دنوں بہت بڑا شہر تھا جس کی آبادی اسّی ہزار سے اُوپر تھی۔ یہ شہر کھیوڑہ سے برآمد ہونے والے نمک کی منڈی تھا جہاں سے دساور کو نمک بھیجا جاتا۔

شیر شاہ صوری نے ۱۵۴۲ء میں قلعہ کی تعمیر شروع کرائی تھی۔ اس کا رقبہ لمبائی میں اڑھائی میل اور چوڑائی میں ایک فرلانگ ہے۔ اس کی دیواریں تیس فٹ چوڑی اور تیس سے چالیس فٹ بلند رکھی گئیں۔ اس میں ۶۸ مینار اور بارہ دروازے رکھے گئے۔ سہیل گیٹ والے حصے کو اب ریسٹ ہاؤس کی شکل دے دی گئی ہے۔ قلعہ کے اندر ایک مسجد بھی ہے مگر رہائشی مکانات موجود نہیں۔

قلعہ کے بعض دروازوں کی اندرونی جانب کسی نہ کسی مردِ کامل کا مزار موجود ہے اور انہی درویشوں کے نام پر بعض دروازوں کے نام رکھے گئے ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مردانِ کامل کی ان دروازوں سے کوئی خصوصیت ہے یا انہیں بطور تبرک وہاں دفن کیا گیا۔

ان دروازوں کے نام یہ ہیں،

۱۔ سہیل دروازہ (غازی سہیل کے نام پر)

۲۔ چانن دروازہ (پیر شاہ چانن ولی کے نام پر)

۳۔ گٹیالی دروازہ (سید میراں حسین شاہ کے نام پر)

۴۔ موری دروازہ (شاہ جمال کے نام پر)

۵۔ طلاقی دروازہ۔

۶۔ خواص خانی دروازہ۔

۷۔ کابلی دروازہ

۸۔ شیشی دروازہ (اس کے محراب پر آیاتِ قرآنی شیشے کے ٹکڑوں سے کندہ کی گئی تھیں)

۹۔ لنگر خانی دروازہ

۱۰۔ شاہی دروازہ

۱۱۔ پیل والا دروازہ

۱۲۔ باؤلی دروازہ (قلعہ میں دو کنوئیں تھے۔ ایک ان میں سے باؤلی تھی بہت گہری ۲۲۳ زینے اُتر کر پانی تک پہنچ پاتے تھے۔

جہانگیر اپنی توزک (جلد اول صہ ۱۹۵) میں لکھتا ہے۔ "رُہتاس کا قلعہ ایسی شکستہ اور ناقص زمین پر تعمیر ہوا کہ وہاں اتنی مستحکم اور مضبوط عمارت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ یہ زمین گکھڑوں کے علاقے سے متصل ہے اور وہ سب نہایت شورش پسند واقع ہوئے ہیں شیر شاہ نے اُن کی سرکوبی کی غرض سے اس قلعہ کی تعمیر شروع کرائی تھی۔ ابھی تعمیر کا آغاز ہی ہوا تھا کہ شیر شاہ مرگیا۔ اور اس کے بیٹے اسلام شاہ نے اس کی تعمیر مکمل کی۔ اس کی تعمیر کے جملہ مصارف کی تفصیل ایک پتھر پر کندہ کی ہوئی قلعہ کے اندر دروازے پر نصب ہے۔ سولہ کروڑ دس لاکھ دام سے کچھ زیادہ خرچ اٹھا جو ہندوستانی سکے کے مطابق چالیس لاکھ ۲۵ ہزار اور ایران کے مروجہ سکے کے مطابق ۲۰ ہزار ایک سو تومان اور تورانی سکے کے مطابق ایک ارب اکیس لاکھ پچھتر ہزار روپے کے برابر ہوتے ہیں۔"

اتنا زیادہ خرچ اس لئے ہوا کہ گکھڑوں نے اپنے علاقے سے تعمیر میں کام آنے والا کوئی پتھر اٹھانے نہیں دیا۔ اسلام شاہ کو دور دراز صوبوں سے پتھر ڈھو کر لانے پڑے اور بقول اکبر نامہ "ایک پتھر ایک اشرفی کے بھاؤ پڑا۔"

قلعہ کی تعمیر ہو چکی تو اسلام شاہ نے اس میں بھاری توپ خانہ رکھا اور ۵۵ ہزار سپاہی متعین کئے۔

جہانگیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ "قلعہ رہتاس کے قریب مجھے ہانکے کے شکار کا موقع ہوا۔ شاہی خواتین بھی اس شکار میں ہمراہ تھیں۔ شکار خوب رہا اور تمام وقت مسرت و شادمانی میں گزرا۔ دو سو کے قریب سرخ اور سفید ہرن شکار کئے۔ اس قسم کے ہرن رہتاس کی پہاڑیوں میں پائے جاتے ہیں اس لئے میں نے حکم دیا کہ ان میں سے کچھ ہرن زندہ پکڑ کر حفاظت میں رکھے جائیں تاکہ ان میں سے چند افزائش نسل کے لئے ہندوستان تک زندہ پہنچ جائیں۔"

رہتاس سے متعلق جہانگیر ایک اور واقعہ بھی لکھتا ہے کہ "مجھ سے بیان کیا گیا کہ جلال خان گکھڑ کا چچا شمس خان جو اس علاقہ میں رہتا ہے، بڑھاپے کے باوصف شکار کا اتنا رسیا ہے کہ نوجوان کو بھی اتنا ذوق و شوق نہیں۔ جب میں نے سنا کہ وہ درویشی اور فقر کی طرف میلان رکھتا ہے تو میں اس کے گھر گیا۔ اس کی عادات اور اطوار مجھے پسند آئے۔ میں نے دو ہزار روپے اس کو اور اتنی ہی رقم اس کے بیوی بچوں کو دی اور اس کے علاوہ پانچ دیہات جن کے محاصل وافر ہیں بطور معاش عطا کئے تاکہ وہ اطمینان اور خوش حالی سے زندگی بسر کرے۔"

پنجاب ڈسٹرکٹ گزیٹر، قلعہ رہتاس کی ہیئت اور حالت کے بارے میں لکھتا ہے کہ قلعہ ۲ ½ کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ دیواروں کی بنیادی چوڑائی بعض جگہ بیس فٹ اور اونچائی تیس سے پچاس فٹ تک ہے اس میں ۶۸ مینار اور بارہ دروازے ہیں۔ دیواروں میں جگہ جگہ بندوق کا نشانہ باندھنے کی خاطر موکھے اور بعض جگہ توپیں نصب کرنے کی جگہ رکھی گئی ہے تاہم یہ قلعہ کسی محاصرہ کی صورت میں بہت زیادہ محفوظ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کے بارہ دروازوں میں سے چند ایک اتنے پختہ نہیں کہ کسی حملہ آور کو روکنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اب اس قلعہ کے کھنڈر ہی باقی رہ گئے ہیں۔ بالخصوص شمالی حصہ کی دیواریں کب کی

منہدم ہو چکی ہیں اور بعض جگہ تو بنیادیں بھی اکھڑ گئی ہیں تاہم چند دروازے ابھی قائم ہیں جن میں سے سہیل دروازہ بہت خوبصورت ہے اور اس کی بیرونی گیلریاں اس دور کے فن تعمیر کا معقول نمونہ ہیں۔ سہیل دروازہ کے علاوہ خواص خانی گیٹ بھی خوب ہے۔ جہلم سے آنے والی سڑک اسی دروازے تک پہنچتی ہے۔ اس کے علاوہ شمال کی جانب لنگر خانہ کا دروازہ بھی قابلِ دید ہے۔ اس حصہ کو ایک دیوار قلعہ کے دوسرے حصوں سے جدا کرتی ہے جس سے قلعہ کے اندر ایک اور قلعہ کی شکل بن گئی ہے جہاں مختصر سی مگر بلند و بالا عمارت کھڑی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۱۵۷۹ء میں اسے اکبر اعظم کے عہد میں مان سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔ قلعہ کے اندر دو باؤلیاں بھی ہیں جن کے زینے معدوم ہو گئے۔ قلعہ کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد کے آثار بھی موجود ہیں۔"

قلعہ کی وسعت میں ایک وسیع قبرستان اور ایک زمین دوز بندی خانہ بھی ہے جس میں مجرموں کو اوپر سے رسوں کے ذریعے نیچے اتارا جاتا تھا۔ کبھی یہ حصہ مسقف رہا ہوگا مگر اب چھت باقی نہیں ہے۔

ہمایوں کو اس قلعہ کے نام ہی سے نفرت تھی۔ اس نے قسم کھائی کہ رہتاس کے قلعہ کو مسمار کرا دے گا۔ لیکن بیرم خان نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کریں۔ تاہم اپنی قسم کو برقرار رکھنے کے لئے سہیل دروازہ کے تین کنگرے گرا دیں کیونکہ کسی کے سر کی پگڑی اتارنا اس کو ذلت کے ساتھ قتل کرانے کے برابر ہے۔ چنانچہ تین کنگرے توپ دم کرا دیئے گئے۔

وادیٔ رہتاس یعنی جہلم سے ڈومیلی تک خطۂ پوٹھوہار کا واحد علاقہ ہے جو ۱۸۱۰ء تک سکھوں کے قبضہ میں نہ آ سکا۔ اس سال راجہ فضل داد کو سکھ دربار نے معزول کر کے مسر لال سنگھ کو یہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ یہ وہی مسر لال سنگھ ہے جو رانی جنداں کا حلیف اور سازشی بن کر سکھ دربار میں وزارت کے عہدہ پر پہنچا اور بالآخر ۱۸۴۶ء میں قیدی بنا کر آگرہ بھیج دیا گیا۔

۱۸۱۲ء میں کشمیر پر دوسری مرتبہ حملہ کے موقع پر رنجیت سنگھ نے قلعہ رہتاس ہی کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ یہیں سکھ فوجیں آکر جمع ہوئیں اور پھر شوپیاں کی طرف کوچ کیا۔ گویا ڈیڑھ سو برس پہلے تک یہ قلعہ قابلِ استعمال تھا۔

۱۹۰۶ء میں پنجاب کے گورنر سر چارلس منڈکاف نے رہتاس کے قلعہ میں ہی دربار لگایا تھا۔

قلعہ کے ایک جانب گھنا جنگل اور دوسری طرف نالہ گھان ہے۔ اس نالہ سے حکومت اور عامی سونا نکالتے رہے۔ اس نالہ کا پانی انتہائی مصفیٰ اور شیریں ہے۔ مغل بادشاہ یہاں سے پانی منگوا کر پیا کرتے تھے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

امرت جسے کہتے ہیں وہ تھا اس گھان کا پانی
حسرت سے نکلتی ہے صدا ہائے جوانی

قلعہ کا منظر آج بھی چاندنی راتوں میں بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے۔ خان گوڈر خان رہتاسی بہت بڑا گویا گزرا ہے جس کے ہندوستان بھر میں کئی شاگرد تھے۔ مغل بادشاہوں نے اس کا گانا سنا اور انعام واکرام سے نوازا۔

علم وادب

ٹیکسلا کے خاتمہ کے بعد کسی بھی دور میں خطۂ پوٹھوہار کو علمی یا تہذیبی مرکز کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ ویسے بھی جو خطہ حملہ آوروں کی راہ گزر بن جائے اس کے علوم و فنون کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

اسلامی عہد حکومت میں اخلاقی اور علمی لحاظ سے اولیائے کرامؒ کی خانقاہوں نے بڑی حد تک خلا کو پر کئے رکھا۔ غور غشتی، نور پور شاہاں، لبشن دور اور گولڑہ شریف میں اونچے پایہ کے دینی مدرسے قائم رہے جہاں سے نامور علماء نکلے اور انہوں نے دینی اور اخلاقی روایات کا چراغ گل نہیں ہونے دیا۔

جہاں تک زبان و ادب کا تعلق ہے پوٹھوہار کی آبادی مختلف نسلوں اور قبیلوں کا ایک ہجوم رہی ہے اسی لئے یہاں کسی خاص تہذیب اور خاص زبان کی چاہت اور لگاؤ نہیں ملتا یہاں ہر دور میں ہر حاکم قوم کی زبان اپنائی گئی خواہ وہ ایرانی عہد کی خروشتی زبان ہو یا برہمنی دور کی سنسکرت اور پراکرت، فارسی ہو یا انگریزی۔

پوٹھوہاری زبان سنسکرت، پالی، آرامی، ساسانی، یونانی، پنجابی اور فارسی زبانوں کے میل جول سے وجود میں آئی۔ جہانگیر اپنی تورک میں ایک سے زیادہ مقامات پر بعض الفاظ کے بارے میں لکھتا ہے کہ فلاں لفظ کو گکھڑوں کی زبان سمجھا جاتا ہے۔

مغل دور میں فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ ظاہر ہے کہ لوگ اسے مسجد و

مکتب میں سیکھتے ہوں گے۔ شاہجہان کے عہد میں سلطان شادمان خان گکھڑ فارسی زبان کا غزل گو شاعر گزرا ہے۔ جس کا مجموعۂ کلام کتابی شکل میں موجود ہے۔ پوٹھوہار کے بعض علم دوست خاندانوں میں کتابوں کے جو ذخیرے موجود ہیں۔ ان میں عربی فارسی کے قلمی مخطوطے شامل ہیں جن میں بعض کو خطاطی کا اعلیٰ ترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کا ذوق تشنہ نہیں تھا۔ مسجدوں کی شکستہ چٹائیوں پر بیٹھ کر علم کی تحصیل کرنے والے اہلِ ذوق، کتابوں کے قلمی نسخے وساور سے فراہم نہیں کیا کرتے تھے بلکہ خطاطی کے فن سے بھی انہیں لگاؤ رہا ہوگا اور فن کوئی بھی ہو اک عمر کی ریاضت چاہتا ہے۔

ہر چند کہ پوٹھوہاری زبان کو علمی زبان کا درجہ کبھی نہیں مل سکا۔ تاہم اس کی علاقائی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈوہیتے، ٹپے، ڈھولے، ماہیئے اور واراں ہمیشہ سے محفلوں کی جان رہے ہیں۔ پوٹھوہاری زبان کی ان تخلیقات سے عوام کی والہانہ دلچسپی کا اندازہ مقامی ریڈیو کی نشریات سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی خطے کی اپنی بولی ہی وہاں کے لوگوں کے دلوں کی ترجمان ہوتی ہے۔

شہری علاقوں میں بلاشبہ اردو اور پنجابی زبانیں بولی جاتی ہیں مگر شہر سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر آج بھی گھروں میں خالص پوٹھوہاری ہی بول چال کی زبان ہے۔

پوٹھوہاری شعروادب میں تہوّر بھی ہے شیرینی بھی۔۔۔ برہا کے گیت مٹیاروں کی زبان پر ہیں تو صوفی شاعروں کا کلام بھی پہروں ذوق وشوق کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

بزم کو برہم ہوئے دو صدیاں بیت گئیں مگر شمعِ بزم کی بجھتی ہوئی لو سے جو دھواں اٹھا تھا وہ پوری طرح ہوا میں تحلیل نہیں ہو سکا۔ مجلسی زندگی کی رنگارنگی معاشی اضطراب کے باوجود قائم رہی بیت بازی کی محفلیں شعروادب سے دلچسپی ہی کا نتیجہ ہیں منظوم سہ حرفیاں موجود ہیں بھرپور معاشقوں کی داستانیں بھی ہیں۔ ایک ایسی ہی داستان قصہ دِل خورشید اعلیٰ پایہ کی نظم ہے جو پوٹھوہاری زبان کی شیرینی کا مرقع ہے۔ پورن بھگت کا قصہ بھی منظوم صورت میں موجود ہے۔

فیروزہ نامی ایک لڑکی دریائے جہلم کے کنارے کسی گاؤں کی رہنے والی تھی اس کی گیارہ منظوم کتابیں

چھپ چکی ہیں۔ اس کو شیرو نامی ایک نوجوان سے محبت ہوگئی۔ اسی محبت کے عالم میں فیروزہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی ان دونوں کی شادی بھی طے ہوگئی تھی مگر رقیبوں نے شیرو کو شب عروسی میں قتل کر دیا۔ فیروزہ نے اس کی موت کے بعد برہا کے گیت گائے اور ۳۳ برس کی عمر میں جوانا مرگی کا شکار ہوگئی۔ جہلم کی وادی میں شیرو اور فیروزہ کی محبت کے افسانے آج بھی دہرائے جاتے ہیں۔

ایک بات غور کے لائق ہے اور وہ یہ کہ پوٹھوہار میں صوفی شاعروں کا کلام بہت مقبول رہا ہے۔ "سیف الملوک" جو حضرت میاں محمد بخش کی تصنیف ہے ایک طویل نظم کی صورت میں اخلاق تصوف اور عرفان کے نکات کی حقیقت کو مجاز کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ زبان اس کی پوٹھوہاری نہیں بلکہ پنجابی کے قریب ہے۔ تاہم اہل پوٹھوہار کے ذوق کی چیز ہے۔

حضرت سید محمد شاہ کی "ہیر" اور دوسرا عارفانہ کلام حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کی عشق مصطفیٰ میں ڈوب کر کہی ہوئی نعتیں آج بھی فضاؤں میں گونجتی رہتی ہیں۔ احمد علی سائیں اور باقی صدیقی اور سلطان ظہور کا کلام اپنا ایک مقام رکھتا ہے اور بھی بے شمار شعرائے کرام ہیں جن کے اشعار ادب کے جوبن کا نکھار ہیں ـــــ کاش میں تذکرہ اولیائے پوٹھوہار" اور تذکرہ شعرائے پوٹھوہار" مرتب کر سکتا۔ یہ کام جوانی میں کرنے کے تھے۔ مجھے امید ہے کہ یہ اہم کام کوئی باہمت نوجوان انجام دے گا۔

دستکاریاں

انیسویں صدی کے اختتام تک پوٹھوہار میں صنعت وحرفت برائے نام تھی۔
کپاس کی پیداوار صرف کاشت کاروں کی ذاتی ضرورتوں کے کام آتی۔ کہوٹہ تحصیل میں کمبل بُنے جاتے۔ وہیں تھیلے اور بوریاں بھی بنائی جاتیں۔ کشمیری دستکار سوت کاتنے کا دھندا کرتے اور تھوڑا بہت ریشمی کپڑا بھی بناتے۔ بعض مقامات پر پھلکاری بھی تیار کی جاتی مگر پنڈی کی سب سے بہتر سمجھی جاتی۔ کپڑے دھونے کا صابن بھی پنڈی میں تیار ہوتا۔
چارپائیوں کے پائے وغیرہ گرمی رولال اور کہوٹہ تحصیل میں موضع سالگراں کے ترکھان بناتے چار پائے دس آنے سے دس روپے تک دستیاب ہوتے۔ یہ شیشم اور پھلاہی کی لکڑی سے بنائے جاتے۔ گھروں میں استعمال کا چھوٹا موٹا فرنیچر، بیٹھنے کی پیڑھیاں وغیرہ اور روئی کاتنے کے چرخے بھی کافی تعداد میں تیار ہوتے۔ پیڑھیوں کی قیمت ایک سے آٹھ روپے اور چرخے کی قیمت ایک سے چھ روپے تک ہوتی۔ لکڑی کا دوسرا سامان، دروازے اور کھڑکیاں وغیرہ بھی دیہات میں بنائے جاتے بالخصوص کہوٹہ تحصیل میں جہاں لکڑی بہت دستیاب ہے۔
گھوڑوں کے زین لشن دور میں بنتے۔ پنڈ دادن خان اور رہتاس کے قریب چوٹالہ میں بہترین کھیس بنائے جاتے۔ لوگ دور دور تحفوں میں لے جاتے۔ وہاں کے بافندے بہت کاریگر ہیں اور آج کل بوسکی اور ٹاسہ وغیرہ نفیس کپڑا بنتے ہیں۔ رہتاس ہی میں گھوڑوں کی لگامیں بنائی

جاتی ہیں۔ دو میلی کے قریب سرگ ڈھن میں چمڑے کا کام اور پوٹھوہاری جوتیاں بنتی ہیں۔ ریشمی تہہ بند پنڈ دادن خان کے بہت مشہور تھے چکوال جوتوں پر زردوزی کے نفیس کام اور منارے کی چٹائیوں کے لئے مشہور تھا۔

کہوٹہ کلر اور نارا کے مختصر بازاروں میں ہندو تاجروں نے چھوٹے موٹے تجارتی ادارے کھول رکھے تھے۔ ان کے مال کی کھپت دریا کے پار ریاست جموں میں ہوتی۔

مری بروری کے علاوہ ضلع راولپنڈی میں کوئی قابلِ ذکر ادارہ نہ بن سکا۔ مری بروری ۱۸۶۰ء میں دو لاکھ کے سرمائے سے قائم ہوئی تھی پنڈی شہر میں رائے بہادر بوٹا سنگھ کی ایک ٹینٹ فیکٹری تھی جو سرکاری ضرورتوں کے مطابق خیمے تیار کرتی۔

لوہے کا معمولی سامان تیار کرنے والی ایک فیکٹری این ڈی ہری رام اینڈ برادرز کی تھی۔

۱۸۹۳ء میں سردار سوجان سنگھ نے دو لاکھ روپے کی لاگت سے راولپنڈی صدر میں ایک مارکیٹ تعمیر کرائی جس میں کریانہ کے علاوہ انڈا مچھلی مرغ بکرے کا گوشت وغیرہ بکتا تھا۔ مارکیٹ کے صدر دروازہ پر ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر تنبیہہ درج تھی کہ کوئی شخص بیف یعنی گائے کا گوشت لے کر اندر داخل بھی نہ ہو۔ بڑے گوشت کی ایک الگ مارکیٹ گوالمنڈی میں تھی۔

معدنی وسائل

دریائے سواں کی ریت سے سونا نکالنے کا دھندا قدیم سے جاری رہا۔ سواں کوہ مری سے ذرا نیچے مسیاڑی گاؤں سے نکلتا ہے اور کوہستانی سلسلوں سے گزرتا ہوا موضع چراہ کے قریب میدانی علاقہ میں داخل ہوتا ہے اور پھر والا سے ۳۵ میل دور چونترہ گاؤں کے قریب ضلع اٹک کی تحصیل فتح جنگ میں داخل ہوتا ہے۔

پوٹھوہار میں سواں کے ساتھ ساتھ جو علاقہ دور تک چلا گیا ہے۔ ماہرین طبقات الارض نے اسے وادیٔ سواں کا نام دیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق یہاں سے پتھروں کے جو قدیم آلات چاقو چھریاں وغیرہ ملے ہیں وہ کم و بیش دو تین لاکھ سال پرانے ہیں۔

سواں کی ریت سے سونا نکالنے والے ہندو نیارئیے دریائے جہلم کے مغربی کنارے کے آس پاس دیہات سے پنڈی آئے تھے۔ انگریزی عہد میں انہیں اس کام کے لئے لائسنس لینا پڑتا تھا۔ حکومت نے خود بھی سرکاری پیمانے پر ریت سے سونا نکالنے کا ٹھیکہ دے رکھا تھا جو ۱۹۲۳ء میں منفعت بخش نہ ہونے کی وجہ سے بند کر دیا گیا کیونکہ سونا نکالنے پر مزدوروں کی دہاڑی اور دوسرے مصارف زیادہ ہوتے سونا کم ہاتھ لگتا۔

سونا نکالنے کا طریقہ یہ تھا کہ پانچ سیر ریت کو پرات میں ڈال کر یہاں تک دھوتے کہ بڑھوں میں ہلکی ریت نکلتی جاتی۔ تا آنکہ صرف کالی ریت باقی رہ جاتی جس میں سونے کے ذرات موجود ہوتے پھر اس میں سیماب ملا کر ہلاتے۔ سونے کے ذرات سیماب میں ضم ہو جاتے۔ اس کو آنچ دکھاتے

تو سیماب اڑ جاتا سونا رہ جاتا۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ صدیوں پہلے پوٹھوہار سے جو محصول مرکز کو بھیجا جاتا وہ سونے کے ذرات کی شکل میں ہوتا۔

پوٹھوہار کے علاقہ میں پیٹرول کے کافی ذخیرے ہیں۔ پہلے پہل راولپنڈی سے ۱۳ میل دور رتہ ہوتر کے مقام پر تیل دریافت ہوا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں اٹک آئل کمپنی مورگاہ نے کھوڑ کے مقام پر تیل دریافت کرکے ایک کنواں کھدوایا۔ اس کنویں سے اب بھی تیل نکالا جا رہا ہے۔ اگرچہ اب اس کی مقدار کم ہوگئی ہے۔

اسی کمپنی نے راولپنڈی سے دو میل دور گولڑہ شریف کی جانب ریلوے لائن کے دائیں جانب ایک کنواں کھودا تھا مگر اس سے تیل زیادہ مقدار میں فراہم نہ ہو سکا تو اسے بند کر دیا گیا۔

میال ضلع کیمبل پور میں بھی ایک کنواں کھودا گیا جس سے دو ہزار بیرل یومیہ خام تیل برآمد ہو رہا ہے۔ اب گوجر خان کے قریب آدھی کے مقام پر بھی تیل برآمد ہوگیا ہے۔ تیل کے سلسلہ میں روسی ماہرین کے تعاون سے ۶۴ء میں توت کے مقام پر تیل دریافت ہوا جس سے چار ہزار بیرل خام تیل ہر روز نکالا جاتا ہے۔

پوٹھوہار میں کوئلہ اور لوہا بھی موجود ہے۔ حسن ابدال میں سیمنٹ اور چونے کا پتھر دستیاب ہے۔ بعض مقامات پر پلاسٹر آف پیرس اور جپسم بھی برآمد ہوا ہے۔ ترکی اور ڈومیلی کی پہاڑیوں سے بینٹو نائٹ مٹی نکلتی ہے۔

ٹلہ جوگیاں کے آس پاس پہاڑیوں سے کوئلہ بھی نکلتا ہے جس کو نکالنے کے لئے چار فرموں نے لیز لے رکھی ہے۔

کھیت کھلیان

خطہ پوٹھوہار کی دیہاتی آبادی کا بیشتر انحصار کاشت کاری پر ہے۔ کسان محنت سے دھرتی کا سینہ چیر کر کاشت کرتا اور اپنی نگاہیں آسمان پر لگائے رکھتا ہے کیونکہ یہ علاقہ بارانی ہے۔ نہریں اور ٹیوب ویل عنقا ہیں اس لئے زمیندار طبقہ بارانِ رحمت کا ہمیشہ منتظر رہتا ہے۔ اللہ کریم کی مہربانی سے رحمت کے چھینٹوں سے یہ زمین کبھی محروم نہیں رہی۔

پوٹھوہار کا کسان پنجاب کے دوسرے دیہات کے کسانوں سے زیادہ جفاکش اور محنتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ برصغیر کے کم و بیش تمام دیہات کی طرزِ معاشرت یکساں ہے تاہم ہر علاقے کی اپنی روایات طرزِ بود و باش اور معاشرت کا رنگ ڈھنگ دوسرے سے مختلف ہے۔

خطہ پوٹھوہار کا کسان صبح دم چڑیوں کی چہکار کے ساتھ بستر سے اٹھتا اور روکھی باسی روٹی کا ناشتہ کر کے ہل جونٹ کاندھے پر جمائے بیلوں کی جوڑی ہانکتا کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے۔ مستورات بھی اذانِ سحر کے ساتھ ہی بیدار ہو جاتی ہیں۔ گھر میں جھاڑو لگاتی ہیں۔ دہی بلوتی اور چولہا چوکا سنبھال لیتی ہیں۔ مرد جب کھیتوں پر چلے جاتے ہیں۔ عورتیں گائے بھینسوں کے "تھان" صاف کرتی اور اپلے تھاپتی ہیں۔ اس طرح گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں دوپہر کا وقت ہو جاتا ہے۔ اب تنور کی پکی سوندھی سوندھی خوشبو والی گندمی روٹی مکھن لسی اور توفیق کے مطابق سالن بھی لے کر کھیتوں کی طرف اپنے مردوں کا لنچ اٹھائے چل پڑتی ہیں۔

سال بھر میں ساونی اور ہاڑی کی دو فصلیں اٹھائی جاتی ہیں۔ ہاڑی کی فصل گندم، چنے اور جو پر مشتمل ہوتی ہے جبکہ "ساونی" کا دامن باجرہ، مکئی، جوار اور تمام دالوں سے مالا مال ہوتا ہے۔

ہر چند کہ زمانہ خاصی ترقی کر گیا ہے۔ جگہ جگہ سکول کھل گئے ہیں۔ نئی نسل کے دیہاتی بچے اور بچیاں جدید تعلیم سے بہرہ مند ہونے لگے ہیں تاہم مڈل اور ہائی درجوں میں تعلیم پانے والے طلباء اور طالبات فصلوں کی کٹائی کے ایام میں درس گاہوں سے غائب ہونے لگتے ہیں۔ فرضی بیماری اور ضروری کاموں کے نام پر رخصت کی عرضیاں گذاری جاتی ہیں اور نئی پود بھی کٹائی میں ہاتھ بٹانے کے لئے کمر باندھ لیتی ہے۔

کٹائی کے ایام میں ہمسایوں سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ ایک گھرانہ دوسرے گھرانے کے تمام افراد کو فصل کی کٹائی میں امداد کی دعوت دیتا ہے اور ان ایام میں ہاتھ بٹانے والے یہ تمام لوگ انہی کے ساتھ رات کا کھانا کھاتے ہیں ہیں۔ مقامی اصطلاح میں اسے "لیتری" کہا جاتا ہے اور سالن روٹی کے ساتھ حلوے کا جلوہ بھی ایک اضافی ڈش کی صورت میں ان مہمانوں کی خاطر شامل کر دیا جاتا ہے۔ پہلے وقتوں میں گڑ کا حلوہ بنتا تھا اب چینی نے گڑ کی جگہ لے لی ہے۔ ایک بڑے حجم کے کڑاہ میں سوجی اور خالص گھی کا یہ پکوان لذتِ کام و دہن کی سوغات سمجھا جاتا ہے۔

فصل جب کٹ کٹا کر کھلیان میں پہنچ جاتی ہے (پوٹھوہاری میں اسے "کھلاڑہ" کہتے ہیں) تو ایک بار پھر "لیتری" کا خوانِ یغما بچھایا جاتا ہے۔ اور دعوت اڑائی جاتی ہے۔ اس طرح دیہات میں بسنے والے یہ سیدھے سادے اخلاص کے بندے ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں اور محبت و خلوص کے ساتھ مہمانیاں کھاتے کھلاتے اور حلوہ اڑاتے ہیں ؎

ادیم زمیں سفرۂ عام اوست
بریں خوانِ یغما چہ دشمن چہ دوست

فصل کا حاصل جب بوریوں میں بھر کر گھروں کو پہنچتا ہے تو اس غلے کو مٹی کے بنے ہوئے چوکور مٹکوں یا کلھوٹوں میں ذخیرہ کر دیا جاتا ہے ان مٹکوں کے نیچے سوراخ ہوتے ہیں جنہیں کپڑے ٹھونس کر بند

رکھا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت اجناس نکال کر استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ اپنی سال بھر کی ضرورتوں سے جو اجناس فاضل ہوں انہیں بیل گاڑیوں میں لاد کر منڈی اور بازار میں لے جایا جاتا ہے اور اونے پونے داموں بیچ کر جو رقم مل جائے اس سے کپڑے، جوتے، تیل، صابن وغیرہ ضرورت کی اشیاء خرید کر لائی جاتی ہیں۔

شہروں کا ذوقِ طبع اور نفاستِ نفس آٹے کی فطیری یا تنوری روٹی پر اکتفا نہیں کرتا۔ یہاں اب گندم سے میدہ برآمد کر کے کیک، پیسٹری اور بسکٹ بنائے جاتے ہیں اور اگر کسی دیہاتی کا جی للچائے یا رال ٹپک آئے تو وہ اپنی ہی کوڑیوں کے دام بیچی ہوئی گندم کو بدلی ہوئی شکل میں دس گنا دام دینے اور خرید کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ اپنی اپنی قسمت کی بات ہے کہ وہ ابنِ آدم جو مشقت اٹھاتا اور بیج بوتا ہے کرنسی نوٹوں کی فصل نہیں اٹھاتا اور وہ جو محض نلے کو پسواتا اور خمیر بناتا ہے وہ مزے اڑاتا ہے۔

کٹائی کے دنوں میں کسان چھوٹا ہو یا بڑا۔ ایک قطعہ زمین کا مالک ہو یا مربعوں والا زمیندار، سخاوت اقلیم کے والی سے کم نہیں ہوتا کیونکہ اہلِ حاجت کی بھیڑ اس کے کھیتوں کے پاس اس آس میں لگی ہوتی ہے کہ اپنا اپنا حصہ پائے۔ اپنا حصے کی طلب میں "کمیں لوگ" برس بھر منتظر رہتے ہیں۔ یہ صدیوں کی ریت اور روایت ہے جو جہاں تہاں قائم ہے۔

کٹائی کے ایام انتہائی مصروف ہوتے ہیں۔ گھر کے تمام افراد بچوں سمیت دن بھر کھیتوں ہی میں موجود رہتے ہیں اور اسی تقریب سے کمیں لوگ بھی متعلقہ خدمات انجام دینے کے لئے وہیں آ جاتے ہیں نائی اپنی "رچھانی" بغل میں لٹکائے لوہار کٹائی کے آلات کی درستی اور ان کو تیز کرنے کے لئے ہمہ وقت موقعہ واردات پر حاضر رہتے ہیں کمہار اور ملیار (سبزی والا) بھی نہیں چوکتا۔ تاآنکہ یہ سارے اپنے اپنے حصہ کی گندم کی گڈی حاصل کر کے ہی وہاں سے ٹلتے ہیں خاص طور پر باڑی کی فصل خصوصاً گندم کی کٹائی کے موقع پر تو نیچ کھیت ہی اپنا حصہ وصول کر لیتے ہیں۔ اس دوران خوانچے والے دال بوندی اور مرنڈے وغیرہ لے کر کھیتوں کی مینڈھ پر بازار سجائے رکھتے ہیں اور بچوں کو حکھوتھیاں کرتے اور اپنے حصہ کی گڈی حاصل کر کے وہاں سے ٹلتے ہیں۔

ہاں ایک ضروری بات تو سہو ہو چلی تھی جب گندم کی کٹائی کے سلسلے میں مدد اور "ریتری" بلائی جاتی ہے تو اس موقع پر ڈھول ڈھمکے کے ساتھ لوگ ناچتے گاتے بھنگڑا ڈالتے ہوئے آتے ہیں اور فصل کی کٹائی میں جُت جاتے ہیں۔ ڈھول میراسی پیٹتے ہیں اور اس علاقے میں ان کو "دادکا" کہا جاتا ہے۔ کٹائی کے کام کے دوران بھی یہ "دادکے" اپنے ڈھول کے آہنگ کا رنگ جمائے رکھتے ہیں۔ اسی طرح گندم کٹ کٹا کر جب کھلیانوں میں پہنچ جاتی ہے تو ایک بار پھر "ریتری" بلائی جاتی ہے۔ میراثی خوب زور زور سے ڈھول پیٹتا ہے اور لوگ فصل کے گاہنے میں مدد دینے کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ یوں کام جلد نمٹ جاتا ہے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ بدلتے ہوئے حالات میں قدیم دستور اور روایات کم ہوتی جارہی ہیں اب ٹریکٹر اور تھریشر وغیرہ استعمال میں آنے لگے ہیں جس کی وجہ سے کمیں لوگوں کے حصۂ رسد میں بھی کمی واقع ہونے لگی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ؎

ہر دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

فصل گاہنے سے قبل کھلیان (جسے مقامی بولی میں کھلاڑہ کہا جاتا ہے) کی تیاری کا منظر بھی نیارا ہوتا ہے۔ کٹائی کے ہنگام کسان کی نگاہ ایک بار پھر سوئے فلک جمی ہوتی ہے کہ بارش کا چھینٹا پڑے اور کھلیان تیار ہو۔ اگر ترشح ہو جائے تو وہ جگہ جو کھلیان کے لئے مخصوص ہوتی ہے اس پر گھر کے تمام چوپائے گدھے، گائے، بھینس اور بیل ہنکا ہنکا کر چلائے جاتے ہیں۔ ان کے سُموں سے اُٹھنے والی گرد کو عورتیں ساتھ ساتھ صاف کرتی جاتی ہیں حتیٰ کہ وہ جگہ بالکل ہموار اور ایسی نتھری ستھری دکھائی دینے لگتی ہے۔ جیسے سیمنٹ میں خاکستری رنگ ملا کر اس جگہ پلستر کیا گیا ہو۔ بس اگر بارش نہ ہو تو پھر عورتیں کنوؤں سے پانی بھر بھر کے لاتی اور اس مقام کی تیاری کے لئے وہاں چھڑکاؤ کرتی ہیں۔ اب وہ مقام فصل گاہنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور فصل کاٹ کاٹ کر وہاں پہنچائی جاتی ہے اور فصل کے گٹھوں کو جس انداز میں اوپر نیچے رکھ کر اونچا سا چبوترہ نما بنا دیا جاتا ہے۔ اسے مقامی بولی میں "گداز"

یا گری" کہتے ہیں۔

اس موقع پر بھی "لیتری" بلائی جاتی ہے اور گائے بیلوں کی مدد سے فصل کو گاہنے اور دانوں کو خوشوں یا بھوسے سے الگ کرنے کا کام انجام پاتا ہے۔
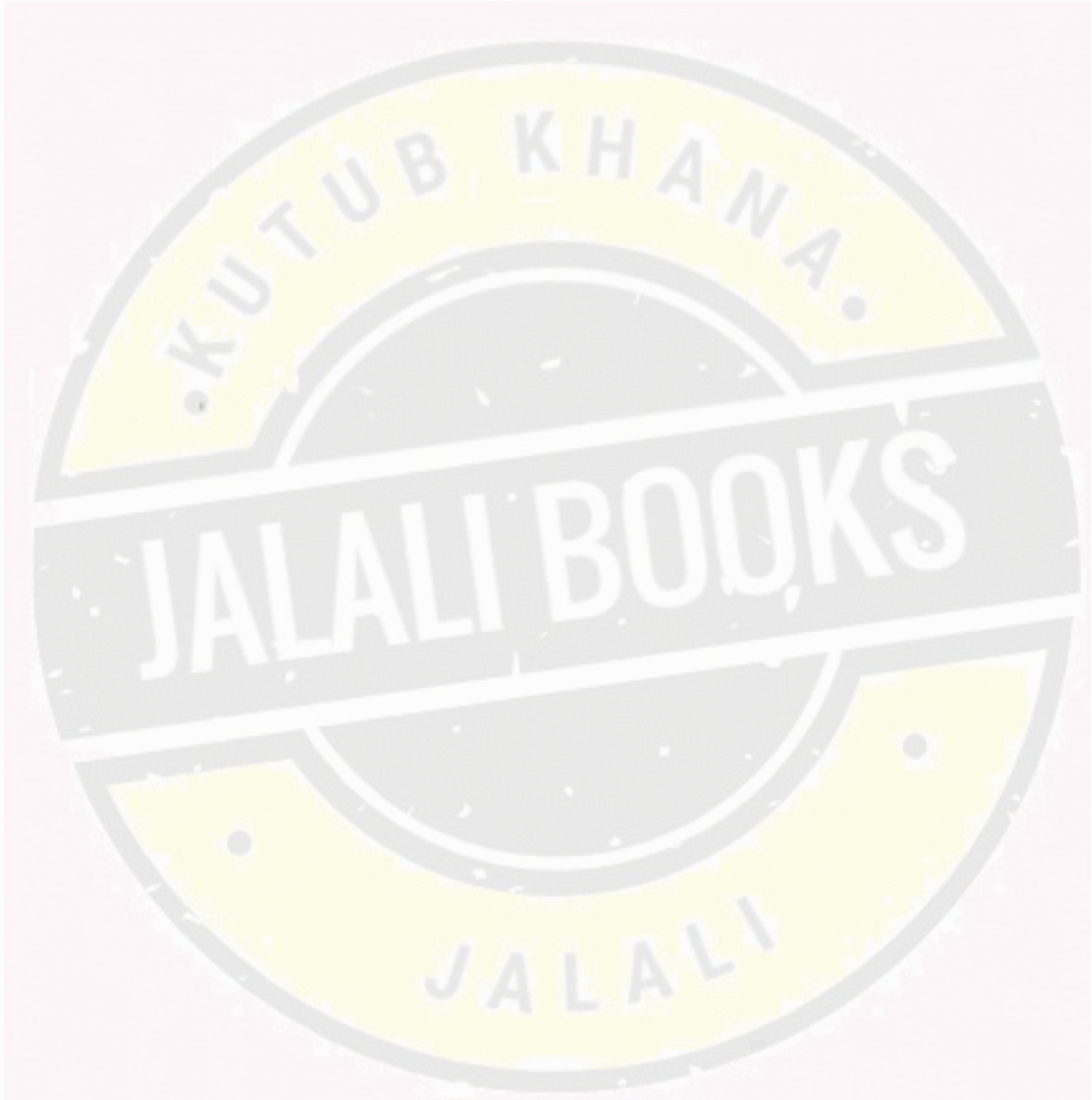
لوک ریت کے رنگ

نصف صدی پہلے کا زمانہ ـــــ میرے بچپن کے دن تھے۔ میں آبا مرحوم کے ساتھ پوٹھوہار کے بیشتر دیہات میں آیا گیا ہوں۔ وہ جب کسی بڑے زمیندار یا مشہور گدی نشین کے یہاں علاج کے لئے بلوائے جاتے، مجھے قصداً ساتھ لے جاتے۔ ان معصوم یادوں کی پرچھائیاں میرے تصور میں گھوم رہی ہیں۔ دیہات کی کشادہ اور سادہ فضا میں کسی حویلی کے آنگن میں بندھے ہوئے ڈھور ڈنگروں کی جگالی کا سماں نگاہوں میں گھوم رہا ہے۔ ہم سن بچوں کے کھیل کود۔ کبڈی۔ دوڑ اور کلائی مروڑ قسم کی دلچسپیاں مجھے یاد ہیں۔ مساجد میں کلام پاک پڑھنے والے طلباء اور طالبات کے صف بستہ گروہ اور شکستہ چٹائیوں کو ابھی بھولا نہیں ہوں۔ دیہات کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو جو سانجھ سویرے کسی جوہڑ کے کنارے سے ابھر کر فضا میں پھیل جاتی ہے، میرے مشامِ جان میں ابھی محفوظ ہے شہروں کی گہما گہمی اور ہماہمی کی بات اور ہوتی ہے۔ دیہات کی ہوا اور فضا اور چیز ہے۔ شہروں میں لوگ پانی ملے دودھ کی چائے پی پی کر شورِ زندگی بپا کرتے ہیں اور دیہات کا تو پانی بھی ان دنوں دودھ سے کم نہ تھا۔ وہاں ان دنوں چائے کا جوشاندہ بخار کی حرارت دور کرنے کا مجرب مارو گردانتے تھے ادھر شہر کے لوگ جب ماں کا دودھ چھوڑتے ہیں انہیں چائے کی گڑھتی لگ جاتی ہے۔

میں چھ سات برس کا تھا جب مجھے دیہات والوں کو اول اول دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان بے ریا مہمان نوازوں کی آنکھوں میں چمکنے والی وفا اور خلوص کی جھلک میرے حافظہ میں تازہ ہے۔ والد مرحوم بہت قیمتی لباس پہنتے تھے اور ٹھیک اسی تراش کے کپڑے میرے لئے بھی بنوایا کرتے کیونکہ میں ہی

تنہا ان کی شفقت کا مرکز تھا میرے تین بہن بھائی چند ہی ماہ کے وقفہ میں وفات پا گئے تھے۔
ہم جب کسی دیہات میں پہنچتے تو لڑکیاں جھولنا چھوڑ کر ایک طرف ہو جاتیں۔ گھروندوں کے سادہ سادہ مکین ہمیں یوں دیکھتے جیسے ہم کسی اور ہی فلک کے ٹوٹے ہوئے تارے ہیں۔ پاس سے گذرنے والا ہر شخص ہمیں سلام علیکم کہتا ــــ یہ مسئلہ مجھے اہلِ پوٹھوہار ہی سے معلوم ہوا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کو سلام کہنے کے لئے کسی باضابطہ تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔

پوٹھوہار کے دیہات میں سینما نام کی کوئی شے ابھی نہیں پہنچی اور انٹرکانٹی نینٹل تہذیب بھی وہاں رائج نہیں۔ مفلس ہی سہی پر وہ لوگ کتنے مخلص تھے اور ہیں۔ اگرچہ جدید معنوں میں وہ "مہذب" پہلے تھے نہ اب ہیں۔

دیہات کے لوگوں کا رہن سہن رواج کا پابند ہے اور رسوم ورواج کی پاسداری ہر کام میں مقدم سمجھی جاتی ہے خواہ اس میں کتنی ہی تباحتیں ہوں۔ شادی بیاہ کے وقت دھوم دھامی کے مظاہرے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ جمع جتھا یا قرض اٹھا کر بھی ناک لمبی رکھنے کا دستور ہے خواتین اپنا ایک طریقہ اور سلیقہ رکھتی ہیں۔ لڑکی کی ولادت ہی سے اس کے جہیز کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ پھر جب شادی کا ہنگام آتا ہے تو حسب توفیق کپڑا لتہ، زیور، برتن فرنیچر وغیرہ لڑکی کو جہیز کی صورت میں دیتے ہیں۔ لڑکی کے جہیز کے علاوہ اس کے تمام سسرالی قرابت داروں کو بھی ایک ایک جوڑا کپڑوں کا دیا جاتا ہے۔ برات کی پذیرائی کی خاطر سارے گاؤں والے بلوائے جاتے ہیں۔ دیہات کے پیشہ ور افراد کو جنہیں مقامی اصطلاح میں "کمیان" کہتے ہیں۔ خوب دل کھول کر "لاگ" دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان بیچاروں کی بازیافت کے یہی مواقع ہیں جو شادی بیاہ پر آتے ہیں۔

شادی کے مواقع پر سوانگ رچانے کی قدیم رسم آج بھی موجود ہے۔ یہ سوانگ ناٹک کی صورت میں ہوتے ہیں۔ عشق و محبت کی کوئی داستان ڈرامہ کی جاتی ہے یا مزاحیہ انداز میں نقلیں اور سوانگ بھرے جاتے ہیں ــــ مزے کی بات یہ ہے کہ پوٹھوہار کا علیحدہ کلچر ہونے کے باوجود ایسے

مواقع پر پنجاب کی ٹھیٹھ عشقیہ کہانیاں دہرائی جاتی ہیں۔ مثلاً سوہنی مہینوال۔ مرزا صاحباں اور ہیر رانجھا وغیرہ۔ ہیر رانجھا کی تمثیل حضرت سید محمد شاہ صاحب (کھنیارا شریف) کی "ہیر محمد شاہ" کے بیتوں کے وسیلے سے پیش کی جاتی ہے۔

سوانگ دیکھنے کے لئے نزدیک و دور کے نواحی دیہات سے بھی لوگ آتے ہیں۔ بالعموم کسی بڑی حویلی کے صحن میں یہ تماشہ ہوتا ہے اور عورتیں بچے چھت پر بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔ سوانگ بھرنے والے دیہات ہی کے کمہار ہوتے ہیں جن کو اس فن سے لگاؤ اور مہارت ہوتی ہے۔ ان کو طے شدہ رقم کے علاوہ "ویل" بھی دی جاتی ہے۔ دولہا کے رشتہ دار اور دوست دولہا کے نام کی ویل دیتے ہیں جسے پکار کر نام لے کر کہا جاتا ہے کہ فلاں کی طرف سے دولہا کی "ویل" پنج دس بیس یا پچاس روپے۔"

اس انداز میں بعض اوقات ضد میں آکر بڑھ چڑھ کر "ویل" دیتے ہیں اور مقابلی دوڑ شروع ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے شوق میں سینکڑوں روپے لٹائے جاتے ھیں۔

سوانگ بھرنے کے علاوہ کمہار اینٹیں تھاپتے اور مٹی کے برتن بھی بناتے ہیں۔ سوسائٹی کا نچلا طبقہ جسے انگریزوں نے مردم شماری کے گوشوارہ میں "کمین" لکھ دیا تھا۔ جولاہے نائی، تیلی، ملاح، ماچھی دھوبی، میراثی کمہار موچی اور مصلی وغیرہ تھے۔

نائیوں سے ختنہ اور حجامتوں کے علاوہ باورچی اور پیغام رسانوں کا کام بھی لیا جاتا ہے، یہ رشتہ ناطہ ٹھہرانے میں معقول خدمات انجام دیتے ہیں۔ پوٹھوہار میں ان کی حیثیت "کمین" ایسی تو بعد کو ہوئی اصل میں یہ ان کا پیشہ نہیں تھا بلکہ حکمران طبقہ کے وہ افراد جو اقتدار میں حصہ نہ پا سکتے۔ اس فن کو سیکھ لیتے تھے کیونکہ علاقہ کے والی یا سردار کا کسی غیر سے حجامت بنوانا اور گلے پر استرا چلوانا خطرے سے خالی نہیں سمجھتا تھا۔

گاؤں میں تیلیوں کا کام تیل سپلائی کرنا ہوتا مگر شہروں میں قصاب ان تیلیوں ہی کے رشتہ دار ہوا کرتے۔

جھیور اور ماچھی گھروں میں پانی پہنچانے اور بھاڑ جھونکنے کا دھندا کرتے اور انہی کی مستورات دائیوں کی خدمات انجام دیتیں۔

دھوبی، للاری (رنگ ریز) اور درزی ایک طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔

میراسی اور مطرب زادے گانے بجاتے اور ٹھٹھول کر کے لوگوں کا دل بہلاتے۔ مصلی سب سے کمتر سمجھے جاتے۔ ان کا کام صفائی کرنا ہوتا۔

۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں ان کو "چوہڑا" لکھا گیا۔ یہ تحقیر کی انتہا تھی۔ یہ ملحوظ نہ رہا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہی ان کو مصلی کہا جاتا ہے۔

تقاریب میں سمّی ناچ بھی بہت مقبول ہے۔ ویسے تو یہ ناچ پنجاب کے دوسرے ضلعوں میں بھی ہوتا ہے مگر پوٹھوہار میں اس ناچ کا انداز کچھ اور ہی ہے۔ جب کوئی برات ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتی ہے تو سمّی ناچنے والی ٹولیاں ساتھ ہوتی ہیں۔ ناچنے والے افراد چھاپے کے سفید ملبوس پہنے کمالِ فن دکھاتے ہیں۔ دُلہن کے گاؤں میں کھانے دانے سے فارغ ہو کر پالی جم جاتی ہے۔ درمیان میں ڈھول والے کھڑے ہوتے ہیں اور ناچنے والے خوبرو نوجوان ان کے گرداگرد دائرہ باندھ کر ہاتھوں میں لکڑی کی کھڑتالیں لئے ہوتے ہیں جن پر گھنگھرو لپٹے ہوتے ہیں۔ ڈھول کی تال کے ساتھ ساتھ ناچ کا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ آخر آخر میں رقص کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ ساتھ ساتھ گیت چلتا ہے۔ پرانی فوجیں فتح کے موقع پر سمّی رقص کیا کرتی تھیں۔

پوٹھوہار کی ثقافتی دلچسپیاں میلوں ٹھیلوں ہی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بالعموم عید کے تہوار پر یا کسی بزرگ کے مزار پر مقررہ دنوں میں یہ میلے لگتے ہیں۔ ان میلوں کو بزرگوں کی نسبت

سے عرس بھی کہا جا سکتا ہے مگر عرس کے تقدس کے باوصف ثقافتی جھلک ان میں نمایاں ہوتی ہے۔ عرس کے دنوں میں مزاروں پر نذر نیاز ہوتی ہے اور کھانا پکا کر تقسیم ہوتا ہے اسے "بھنڈارا" کہا جاتا ہے اس مقصد کی خاطر آس پاس کے دیہات سے چندہ کی شکل میں نقدی یا اناج اکٹھا کیا جاتا ہے۔

میلوں ٹھیلوں کے دوران بیلوں کی دوڑ کبڈی گھڑ سواری اور نیزہ بازی کے مظاہرے بھی ہوتے ہیں۔

پوٹھوہار کی بولی ٹھولی اور زبان کے تیور تیکھے تیکھے ہیں جو اسے پنجاب کے دوسرے حصوں سے ممیز کرتے ہیں۔ اہلِ پوٹھوہار کا رہن سہن بود و باش اور معاشرت کا رنگ ڈھنگ ان کی زبان کے مانند دوسرے اہلِ پنجاب سے الگ ہے۔ اس پر مغلئی تمدن کی گہری چھاپ ہے۔ البتہ ترچھی پگڑی باندھنے کا رواج خالص مقامی ہے جسے مغلوں نے گکھڑوں سے دوستی کی وجہ سے اپنا لیا تھا۔ سوانگ، بھرنے والے اور ناچنے والوں کے لابنے کرتے بھی مغلئی انداز کے غماز ہیں۔

جہاں تک معاش کا تعلق ہے۔ خطۂ پوٹھوہار ایک پسماندہ علاقہ ہے۔ اکثر گھرانوں کی گذر اوقات معمولی زراعت پر موقوف ہے اور زراعت کا انحصار بارش پر ہے۔ پورے علاقہ میں بڑے زمینداروں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ محنت کش طبقہ مزارع بن کر دن کاٹتا ہے۔ گھر کے بعض افراد کو ادنیٰ ملازمتوں کی تلاش میں نکلنا پڑتا ہے۔ اس طرح مخلوط کنبہ داری میں مشقت کی چکی پیس کر دو وقت کی روٹیاں مشکل سے حاصل ہوتی ہیں۔

خشک سالی کا خطرہ پیدا ہو جائے اور بہت دنوں تک بارش نہ ہو تو بچے منہ کالا کرکے ڈنڈے بجاتے ہوئے نکلتے ہیں اور گاتے ہیں۔

اولیا مولیا
ساڈی کوٹھی دانے پا

چڑیاں وے مینہ پانی پا

یا پھر گوبر اور کیچڑ بھرے گھڑے کسی چڑچڑے جھگڑالو شخص کے آنگن میں جا کر پھوڑتے ہیں۔ تاکہ وہ گالیاں بکے۔ مگر دیکھا گیا ہے اس روز بارش ضرور ہو جاتی ہے۔

یا کسی نیک بزرگ اور پارسا آدمی کو مرد و زن نہلانے جاتے ہیں اور اس سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اللہ سے بارانِ رحمت کی دعا کرے۔

یا لڑکے لڑکیاں دو گڑیاں لیتے ہیں ایک کو زنانہ دوسرے کو مردانہ لباس پہنا کر جلوس نکالتے ہیں اور سب مل کر پکارتے ہیں۔ گڈی گڈا مر گیا پھر ان دونوں کو آگ کے شعلوں میں پھینک کر بھسم کر دیتے ہیں اور ہاتھ سے چھڑیاں بجا بجا کر نوحہ پڑھتے ہیں۔

گڈی گڈا بالیا

وس میاں کالیا

گڈی گڈا پٹیا

وس میاں چٹیا

کالا پتھر چٹا روڑ

بدل پیا گرائیں کول۔

برسوں یہ رواج بھی رہا کہ گاؤں کی چند خواتین پاس کے کسی گاؤں سے بکریاں چُرا لاتیں۔ ادھر سے اس گاؤں کی خواتین لڑنے جھگڑنے آتیں۔ پھر صلح صفائی ہو جاتی اور چوری کی بکری ذبح کر کے سب مل کر گوشت پکاتے کھاتے۔ یہ اشارہ اس بات کا ہوتا کہ مخلوق خدا بھوکوں مر رہی ہے۔ خدایا مینہ برسا۔

کبھی کسی عظیم المرتبت ہستی سے ہل چلانے کی درخواست کی جاتی۔ ایک مرتبہ ڈپٹی کمشنر سے کہا گیا تو وہ مسکراتا ساتھ چل دیا اور ہل چلانے کھڑا ہو گیا۔ خدا کی شان ہے بارش ہو گئی۔

بعض دیہات میں نماز استسقا بھی پڑھی جاتی تھی اور اب بھی پڑھی جاتی ہے۔

دیہات میں معقول ذرائع آمدنی کے فقدان کے باعث لوگ انڈے مرغی شہر لے جاکر فروخت کرتے اور جو روپیہ دھیلی منافع مل جائے اس سے اپنی ضرورت کی اشیاء خرید کر واپس آجاتے ہیں۔ منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے روزگار کا باضابطہ کوئی وسیلہ نہیں ہوتا اور لوگوں کا فاضل وقت بیکار ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ مال مویشی پال کر اپنی آمدن کا کچھ صیغہ قائم کر لیتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ جس کی مالی حالت قدرے بہتر ہو جاتی ہے وہ دیہات سے شہر کا رخ کر لیتا ہے اور اپنے نیچ عزیز و اقارب سے بلند و بالا کوئی جنس تصور کرنے لگتا ہے اور اس کے بچے شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں کو تھرڈ سنچری اولڈ سمجھتے ہیں۔

سردیوں کے ایام میں جب کاشتکار طبقہ کو قدرے فراغت نصیب ہو جاتی ہے تو بٹیر بازی اور کتوں کی لڑائی کرائی جاتی ہے۔ اتوار کے دن یا کسی چھٹی کے روز کتوں کے دنگل میں خوش فکرے دیہاتی ڈھول ڈھمکے کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ کتوں کے مالک مہینوں اپنے اپنے کتوں کو دودھ مکھن کھلا پلا کر ان کی جانیں بناتے ہیں۔ سائیکل کے ساتھ میلوں دوڑا کر مرغن غذائیں ہضم اور سانس پختہ کراتے ہیں۔ پھر ان کو لڑاتے بلکہ بھڑاتے ہیں۔ ہزاروں روپے کی بازی بد کر یہ شغل فرماتے ہیں۔ جیتنے والی پارٹی خوشیاں مناتی ہے اور کبھی کبھی دو دھڑے بن جاتے ہیں اور خون خرابہ بھی ہو جاتا ہے۔ پھر پشتوں تک دشمنی کی روح پل نکلتی ہے۔ مقدمہ بازی ہوتی ہے۔ زمینیں بک جاتی ہیں۔ نوجوان پھانسی پا جاتے ہیں۔ اولاد دربدر ہو جاتی ہے۔ مگر مونچھ نیچی نہیں ہو پاتی ــــ!

ایک شخص زمین خریدتا ہے۔ دوسرا حق شفعہ جتا کر مقدمہ بازی کرتا ہے۔ پٹواری دونوں پارٹیوں کو خوب لڑاتا اور مال پانی بناتا ہے پھر نتیجہ فساد اور قتل کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اکثر دیہات ایسے ہیں جہاں کے لوگوں کی ذہنیت عجیب ہے کہ وہ دو افراد کو لڑا کر ان کی زمینیں

اونے پونے داموں خرید کر اپنا اُلّو سیدھا کر لیتے ہیں۔ پوٹھوہار کے دیہات میں چوری چکاری نہیں ہوتی البتہ ڈاکے پڑتے ہیں۔ قتل اور اغوا کے معرکے ہوتے ہیں

ان چند قباحتوں کو چھوڑ کر بعض رسوم اچھی بھی ہیں۔ مثلاً کسی گھر میں ماتم ہو جائے تو کفن دفن میں ہاتھ بٹانے کا طریقہ بہت مستحسن ہے۔ بھوک افلاس اور تکبر کی لعنتوں کے باوجود پوٹھوہار کے لوگوں میں وفا سادگی اور مہمان نوازی کے اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔ کوئی اجنبی بھی گھر میں آ جائے تو اسے کھانا کھلائے بغیر جانے نہیں دیتے جو کچھ بھی گھر میں موجود ہو اس میں سے بہتر جنس مہمان کے آگے لا کر رکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ایک واقعہ مشہور ہے کہ سُکھو کے قریب سے ایک برات کہیں دوسرے گاؤں جا رہی تھی گاؤں کے لوگوں نے باصرار پوری برات کو روک لیا اور سب باراتیوں کو کھانا کھلایا اور خاطر مدارات کے بغیر جانے نہ دیا۔ اسی وجہ سے اس کا نام محلہ دلیراں مشہور ہو گیا۔

پوٹھوہار میں ایک قبیح رسم بہت قدیم سے چلی آتی ہے اور وہ ہے شادیوں میں "دو اٹھی" یا "سٹہ" کا رواج یعنی ایک گھر سے لڑکی کا رشتہ لے کر اپنی لڑکی اس گھرانے کے کسی فرد سے بیاہی جائے۔ اس رنگ کی شادیوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک جوڑے میں ناچاقی ہو گئی تو دوسرا جوڑا خود بخود اجڑ جائے گا۔ اور بے گناہی کی سزا بھگتے گا۔ ایسا بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لڑکیوں کو شکر رنجی کے باعث میکے بٹھا دیا جاتا ہے۔ وہ بے چاری نہ تو طلاق حاصل کر سکتی ہیں اور نہ آباد کی جاتی ہیں۔ نہ بساوانہ طلاق ــــ!

دیہات میں بچپن کی شادیوں کا رواج عام ہے۔ جس سے بچے جسمانی لحاظ سے لاغر رہتے ہیں۔ ایسی شادیاں گکھڑوں میں اکثر ہوتی ہیں۔

جہاں تک مذہبی معتقدات کا تعلق ہے لوگ اپنے عقیدے کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور اسلام سے والہانہ شیفتگی رکھتے ہیں۔ پرانے وقتوں سے رواج چلا آتا ہے کہ گاؤں کی مسجد

میں صبح و شام ناظرہ کلام پاک پڑھایا جاتا ہے جیسے بالعموم گاؤں کے بچے اور بچیاں کم عمری ہی میں پڑھ لیتے ہیں۔ بعض دیہات ایسے بھی ہیں جہاں حفظ کرانے کا اہتمام بھی ہے۔ البتہ ایک بات قابلِ غور یہ ہے کہ با جماعت نماز کی پابندی بہت کم دیہات میں پائی جاتی ہے۔

روزہ کی پابندی لازماً کی جاتی ہے۔ روزہ خوروں کو نہایت بُرا سمجھا جاتا ہے۔

پیری مریدی کا دھندا پوٹھوہار کا روز مرہ ہے۔ جاہل مگر چالاک پیر تقدس کا جامہ اوڑھ کر سادہ لوح لوگوں کو خوب لوٹتے ہیں۔

لوگ توہمات کا بھی شکار رہتے ہیں بلکہ وہم اور وساوسہائے شیطانی کے صدیوں سے شکار رہے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے فصلوں کی کٹائی کے زمانے میں آندھیاں بہت آتی ہیں۔ دیہاتی اس وقت کہتے ہیں کہ جنات کا لشکر فصلوں کے خرمن سے اپنا حصہ ہتھیانے کے لئے فضا کے دوش پر سوار چلا جاتا ہے۔ اس وقت لوگ حفاظت کی غرض سے کاغذوں پر اللہ کا نام لکھ کر غلے کے ڈھیروں پر رکھ دیتے ہیں اور خنجر یا لوہے کا کوئی ہتھیار بھی سجا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنات لوہے سے ڈرتے ہیں۔

بچوں کی ولادت کے بعد زچہ کی چارپائی کے قریب بھی لوہے کے ہتھیار رکھ دیے جاتے ہیں تاکہ جن بھوت اور کوہ قاف کی پریاں نومولود یوسفِ ثانی کو اُچک کر نہ لے جائیں۔

بعض زمیندار اتوار کے دن کاشت نہیں کرتے اور منگل کا دن سعید تصور کرتے ہیں کیونکہ جنت سے سطح ارض پر لڑھکنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے بوائی کا آغاز منگل ہی کو کیا تھا۔

آپس میں سر پھٹول کا کوئی خاص دن مقرر نہیں کر رکھا مگر استغاثہ دائر کرنے کے لئے منگل اور ہفتہ بہتر سمجھا جاتا ہے۔ منگل اور بدھ کے روز شمال کی طرف سفر کرنے کو نحس گردانتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

منگل بدھ نہ جاویں پہاڑ
جتی بازی آویں ہار۔ !

دن کے وقت گھوڑا ہنہنائے تو استغفار پڑھتے ہیں۔ بھادروں میں گائے پھوٹے یعنی بچھڑا جنے تو سخت منحوس خیال کرتے ہیں۔

جہاں تک لطیف حِس کا تعلق ہے مرد وزن اس سے بہرہ ور ہیں گوجر خان کے قریب کسی گاؤں کے دُھنیے نے جس کا نام بابا بدھو تھا۔ ایک عورت سے شادی کی۔ دو چار روز کے بعد وہ روئی دھنتے ہوئے کچھ گنگنا رہا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ چل بدھو آٹھو آٹھو۔ مقصود اس کا یہ تھا کہ یہ اس کی آٹھویں شادی ہے ___ اُدھر اس کی نیک بخت زوجہ چرخہ کات رہی تھی۔ اس نے مسخرے شوہر کے مذاق کو پا کر یہ بول گنگنانے شروع کئے۔

نہ دو تے نہ چار۔
چپ چپاتے پنجن مار۔
چرخہ میرا پھیرواں۔
توں مریں تے کرساں تیر ہواں[13]۔

پچھلی بات

عزیز ملک نے اس کتاب "پوٹھوہار" میں پس پردہ ماضی جھانکتے ہوئے، سکندر اعظم کے حملہ سے لے کر زمانہ حال تک اس خطہ کی تاریخ، روایات، تمدن، معاشرت، ثقافت اور اولیائے کرامؒ سے اپنے قاری کا تعارف نہایت پرلطف، دلچسپ اور مخصوص اسلوب نگارش میں کرایا ہے۔

یہ خطہ جسے ہم پوٹھوہار کہتے ہیں جس دن سے زمین معرض وجود میں آئی دھرتی کا حصہ ہے حضرت انسان نے اس خطہ زمین پر ہزاروں سال پہلے قدم رکھا۔ یہاں کی تہذیب دنیا کی اولین تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے۔ معلوم نہیں اس وقت اس خطہ کا کیا نام ہوگا۔ بہرکیف آریاؤں کی آمد اور سکندر اعظم کے حملہ کے بعد اسے تاریخ کے اوراق پر جگہ ملی ہوگی۔ اس زمانہ میں بھی علم و فن، تہذیب و تمدن، عسکری صلاحیتوں سے یہ خطہ مالا مال تھا۔ ہندوستان پر بالعموم اور یہاں بالخصوص ایرانی تہذیب کا گہرا اثر رہا۔ تقریباً تین ہزار سال تک ہند کے راجے ایرانی سلطنت کے باجگذار رہے۔ ایرانی افواج شمالی اور جنوبی ہند میں کسی نہ کسی مقامی فوج کی مدد کے لئے پہنچتی رہیں۔ راجہ "مہاراج" کے زمانے میں سالار "سام" کی سرکردگی میں کئی ایرانی سرداروں کو شمالی ہند، سیالکوٹ اور پہاڑوں کے ساتھ ساتھ راجوری تک جاگیریں بھی دی گئیں۔ ایران میں ان دنوں کیانیوں کی بادشاہت تھی اور کیانی اکثر یہاں آتے جاتے رہے۔

راجہ پورس نے عنان حکومت سنبھالتے ہی ایرانی سلطنت کو خراج دینا کر دیا لیکن اس

کے ہمعصر راجے مہاراجے بدستور خراج بھیجتے رہے۔ بہت دن نہیں گزرے تھے کہ پورس کو سکندر سے نمٹنا پڑا۔ ان دنوں ایران کے سورج دیوتا کے عروج کا سایہ رومنوں، شامیوں اور فرنگیوں وغیرہ پر پڑ رہا تھا۔ اور برصغیر بھی ان کے حلقہ دامان میں تھا۔ ایران سے جو سردار "سورج پرستی" کو لائے انہیں "ککا" کہا گیا۔ ککا فارسی میں سورج کو کہتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ککا۔ گکر کھکر انہی ایرانی سرداروں کی اولاد ہوں۔ اس کے بعد بھی ایران سے بت پرستی۔ آتش پرستی، شمالی ہند سے ہوتی ہوئی ہند کے کونوں کھدروں تک جا پہنچی۔

مسلمانوں کی آمد کہف الدولہ والاسلام، امین الملت۔ یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی سے ہوئی جو مختلف حملوں میں اپنے ساتھ علمائے کرام مشائخ عظام اور مفکرین اسلام کو لائے یہ برگزیدہ نفوس خطہ پوٹھوہار ہی سے گذرتے ہوئے ہند کے کونے کونے میں تشریف لے گئے۔ حضرت پیر مکیؒ، حضرت قطب شاہ علویؒ، حضرت علی ہجویریؒ اور کئی دوسرے حضرات نے اس خاک کو شرف بخشا۔

اس علاقہ میں داخل ہونے سے پہلے سلطان محمود کو راجہ جے پال اور آنند پال سے باری باری نبرد آزما ہونا پڑا۔ محمود کے ساتھ دوسرے لوگوں کے علاوہ کیانی نسب خان کیگوہر المعروف گکر شاہ یا گکرشاہ بھی آیا۔ سوال پیدا ہو سکتا ہو کہ خان کیگوہر کو گکرشاہ کے عرفی نام سے پکارنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ہو سکتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے جو خود ایرانی نژاد اور نوشیروان عادل کی اولاد سے تھا یہ اندازہ کیا ہو کہ کیانی خاندان اور دوسرے ایرانی جو زمانہ قبل مسیح سے یہاں آباد اور شمالی ہندوستان میں بالادست ہیں اور ہندوؤں کے ساتھ بود و باش کے بعد ان کے طور طریقے اپنا چکے ہیں اور اب کھکر۔ کاکڑ یا ککے کہلاتے ہیں اس لئے اس نسل کے شہزادے خان کیگوہر کو گکر شاہ پکار کر ساتھ رکھا جائے۔

ہندوؤں کو شکست دینے کے بعد سلطان محمود نے درمیانِ نیلاب و وہت (اٹک و جہلم) خان کیگوھر کو دے دیا تاکہ اس علاقہ کا نظم و نسق سنبھالے اور ان لوگوں میں اپنا اثر و رسوخ

بڑھائے جو ایرانی نژاد ہیں۔

مسلمانوں کے دور میں یہ خطہ سلطنتِ کابل و کشمیر کا حصہ تھا اور کیگوھر کی اولاد کم و بیش ۹۹۰ء سے ۱۷۶۵ء تک (کیگوہر نامہ کی تحقیق کے مطابق) اس علاقے پر مطلق العنان رہی۔ کئی تاریخی کتابوں میں کیگوہر کی اولاد کے مُلک اور سلطانوں کا ذکر اور ان کے قلعوں روات، پھروالہ سلطان پور اور دانگلی کا حال درج ہے۔

بابر نے تزکی میں انہیں گکّر کہا ہے۔ فرشتہ اور ابن خلدون کھکر لکھتے ہیں جو مترجمین کے تصرّف کی بدولت کہیں گکھڑ اور کہیں کھوکھر لکھے گئے۔ "کھ" "چھ" "ٹھ" پرانی بھاشا کے الفاظ ہیں ہندکو اور اس کی شاخوں مثلاً سرائیکی، پوٹھواری، پنجابی وغیرہ میں ک گ کے ساتھ اکثر بولے جاتے ہیں۔ اس لئے وقت کے بہاؤ اور مختلف مورخین کی طبع آزمائی کے باعث ککا یعنی "سورج دیوتا" کے ماننے والے ککر، کاکر، ککرو، کھکر، کھوکر، گکر اور گکھڑ بن گئے ہیں۔

گکر یا ککر کئی پشتوں تک کشیر اور چھوٹا تبت (بلتستان) پر حکومت کرتے رہے۔ آج بھی بارہ مولا اور سری نگر کشمیر میں جو کیانی یا گکر آباد ہیں۔ انہیں ککرو کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کے بزرگ خواجہ عبدالصمد ککرو محتاجِ تعارف نہیں۔ وہاں انہیں مرزا اور راجہ کے بجائے خواجہ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح راولاکوٹ بلندری اور پونچھ میں انہیں گکر کہتے ہیں اور بعض خاندان گکر راجہ یا سردار کہلاتے ہیں۔

شمالی علاقوں میں گلگت اور نگر میں کیانی آباد ہیں۔ نگر گلگت اور ہنزہ کے حکمران خاندان کیانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور میر کہلاتے ہیں۔ گکر بالعموم راجہ کہلاتے ہیں اور بعض جو ذرا متقدر ہیں مغلوں سے رشتے ناطے کی وجہ سے مرزا، ملکا اور سلطان بھی کہلاتے ہیں۔ پھروالا کا اومال خاندان جو سلطان آدم کی اولاد ہے، بڑا خاندان ہے اور اس خاندان کا سربراہ یہ سارے القابات استعمال کرنے کا مجاز ہے۔

بعض کتب تاریخ میں ذکر ہے کہ تیس ہزار کھکروں نے محمود کا مقابلہ کیا۔ اس مقابلے کے فوراً بعد اس نے لیگو ہر عرف ککر شاہ کو ساتھ ملا لیا اس کے علاوہ محمود کے ساتھ "کھکروں" کی محاذ آرائی کا کہیں ذکر نہیں۔ البتہ خاندانِ غور سے نبرد آزمائی کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ اگر گکھڑ کھکروں سے علیحدہ قوم ہیں اور اٹک اور جہلم کے درمیان یا شمالی علاقوں میں کسی جگہ انہیں حکمرانی کا حق دیا گیا تھا وہ محمود کے دشمن خاندان یعنی شہاب الدین غوری سے کیوں نہ ٹکرائے اور صدیوں بعد ظہیر الدین بابر کی توزک میں ہی ان کا ذکر دیکھنے میں آیا۔ بیچارے کھوکھر ہی محمود کے خلاف لڑے اور غوریوں کے ہاتھوں بھی وہی پٹے، حتیٰ کہ شہاب الدین محمد غوری کو گکھڑوں کے علاقے "دھمک" (نزد سوہاوہ) آ کر قتل کر دیا اور گکھڑ بیچارے مصلے بچھائے یاد الٰہی میں مصروف اور خاموش تماشائیوں کی طرح ٹک ٹک دیکھتے رہے یقین نہیں آتا کہ جو قوم شیر شاہ سوری کے خلاف ہمایوں کی حمایت میں اس قدر محاذ آرائی کرے کہ تاریخ عش عش کر اٹھے ان سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ اپنے محسن محمود غزنوی کے دشمنوں سے بدلہ نہ لے۔

تزک بابری، ہمایوں نامہ اور دوسری تاریخی کتابوں میں مغلوں کی آمد کے زمانے میں آخر "کھوکھر" کہاں ناپید ہو گئے کہ ان کا تذکرہ مغلوں کے موافق یا مخالف کہیں نہیں ملتا۔ مغلوں کے زمانے میں کھوکھر ایسے روپوش ہوئے جیسے گکھڑ کئی صدیوں تک محمود غزنوی کے بعد نظر نہیں آئے اور یکا یک بابر کے وقت میں نمودار ہو گئے۔ بابر ہی انہیں گکر لکھتا ہے اور وہ مغلیہ دورِ حکومت کے دوران گکر ہی کہلائے جو پوٹھوہاری زبان میں ک کی جگہ گ اور ر کی جگہ ڑ لگ کر گکھڑ ہو گئے۔ یہی تلفظ عام بول چال میں استعمال ہوتا رہا۔ اگرچہ تاریخی کتب میں گکر یا کھکر ہی رہا۔

بابر نے بھیرہ کٹاس، کلر کہار، بھروال وغیرہ سارے علاقے میں لشکر کشی کی۔ وہ اپنی تزک میں پوٹھوار اور اس کے نواحی علاقے کو پنڈ دادن خان سون سکیسر اور اس سے اوپر ضلع جہلم راولپنڈی ہزارہ کیمبل پور اور دریائے اٹک تک کے علاقہ کو ولایتِ گکراں کہتا ہے۔ اسے ان علاقوں میں کہیں

کھوکھروں سے پالا نہیں پڑا۔

اس کے بعد چودھویں صدی کے مورخ ابن خلدون اور سترہویں صدی عیسوی کے محمد قاسم شاہ فرشتہ نے بھی کھکروں ہی کا تذکرہ کیا ہے کہیں گکھڑ کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

۱۶۱۲ء میں محمد قاسم نے بیجاپور میں بیٹھ کر تاریخ فرشتہ لکھی تو اس میں کھکروں کے علاوہ تمام سلاطین کا ذکر کیا۔ اس نے خود اعتراف کیا ہے کہ "شیخا کھکر" نے لاہور میں اس کے جد امجد ہندو شاہ کو ذلیل کیا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی تاریخ میں اس خاندان کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے ادنیٰ جاگیرداروں تک کو "سلطان" کے لقب سے نوازا اور بڑے کروفر سے ان کا ذکر کر دیا۔

اس ذاتی تعصب کی تلافی کے لئے والئ پوٹھوہار دلاور خان دولو مراد سلطان گکھڑ نے تاریخی واقعات کی صحت کے لئے رائے زادہ دُنی چند کی خدمات حاصل کیں۔ رائے زادہ دُنی چند اس وقت کا مانا ہوا عالم فاضل را تھا۔ سلطان دلاور خان کے بھائی مبارز الدین حاکم اکبر آباد نے بھی اس سے کہا کہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں ہر ایرے غیرے کا ذکر کر دیا ہے اور ہمارے مثالی کردار کو بھونڈے طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے یہاں تک کہ ترا بیہ قبیلہ کی علتیں بھی ہمارے کھاتے میں ڈال دی ہیں۔

چنانچہ رائے زادہ دُنی چند نے "کیگوھر نامہ" مرتب کیا۔ اس میں سینہ بہ سینہ روایات کے علاوہ خاندانی شجروں اور علاقہ بھر سے جو حقائق بھی اسے مل سکے کتابی شکل میں جمع کر دیئے جو ۱۷۲۰ء تک کے واقعات کو محیط ہیں۔ اس نے بھی کھکر کی جگہ گکھڑ ہی استعمال کیا ہے۔ یہ ایک پرلطف ادبی کتاب ہے جسے اشعار سے مزیّن کیا ہے اور خاص طور پر ـــــ "در اوصافِ مستورات گکھڑاں اور" در اوصافِ قاضیاں" وغیرہ نظموں میں فرشتہ کے الزامات کو رفع کیا ہے۔

مورخین نے پوٹھوہار کو درمیان اٹک وجہلم ایک سرسبز و شاداب خطہ لکھا ہے۔ اتنا سرسبز

اور جنگلی جانوروں سے پُر کر بابر نے پنڈی کے پاس شیر اور پھچپہ میں کرگدن (گینڈے) کا شکار کیا تھا۔

"پرت" یا "پوٹ" بھاشا میں پھول کو کہتے ہیں۔ "پوٹھ ہار" کے معنی ہیں پھولوں کا ہار ـــ بقول شاعر ؎

درمیانِ اٹک وجہلم مرغزار
سرزمینِ کھلاہاں پوٹھ ہار

"گیگوھنامہ" میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے۔

زمینش خوش ہوائش خوش بہار است
ز رعنائی گلستان پوٹھ ہار است

علاقائی بول چال میں پوٹ کو پوٹھ بولا جانے لگا اور گکھڑ سلطانوں کے عہد میں اس خطہ کا نام "پوٹھوار" پڑا۔ جہانگیر اپنی تزک میں اس خطہ کی زبان کو گکھڑوں کی زبان اور علاقے کو "سرزمینِ گکھراں" لکھتا ہے۔ اسے بھی کھوکھر کہیں نظر نہیں آئے۔

اس خطہ کو جہاں مفکرینِ اسلام نے رونق بخشی وہاں ابوالفتح البیرونی نے قلعہ نندنہ کی دیوار پر بیٹھ کر ریاضی کا عظیم کارنامہ دنیا کا قطر ناپ کر سرانجام دیا۔

ہر حملہ آور اور آنے جانے والا ان کھلاہوں کی اجازت سے ہی ہندوستان کو آتا اور انہی کی اجازت سے کابل کو جاتا سلاطینِ لاہور اور سلاطینِ دہلی کے زمانے میں اور پھر مغلوں کے دور میں یہاں کے بسنے والوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

شجاعت اور خلوص کی داستان آج بھی اس خطہ کے ذرّے ذرّے میں بسی ہوئی ہیں۔ ہر تحریک سے یہاں کا کوئی نہ کوئی فرد وابستہ رہا۔ شجاعت، صداقت، حوصلہ مندی اور جرأت کے پیکر ہر صف میں ڈٹے نظر آتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے اوائل میں نادر شاہ مغل سلطنت کی بنیادیں ہلا گیا۔ سادات بارہ کی مہربانیوں سے رہی سہی کسر نکل گئی۔ دق کے مریض شہزادے بھی بادشاہ بننے لگے۔ سلطنت کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر مرہٹوں نے سر اٹھایا اور دہلی کے مضافات پر بھی دست درازی کرنے لگے۔ پوٹھوہار میں ان دنوں سلطان مقرب خان (کچھ تاریخوں میں مکرم خان لکھا ہے) بادشاہ تھا وہ انتہائی زیرک خدا ترس اور اولوالعزم تھا۔ اس نے اپنی حدود کو اٹک سے لاہور تک بڑھا لیا تھا۔ مرہٹوں کا زور اسلام کے ہر ستون کو گراتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مسجدیں مسمار کی جا رہی تھیں۔ دین حق معرضِ خطر میں تھا جس کے پیش نظر قطب دوراں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمان فرمانرواؤں کو ایلچی بھیجے اور کفار کے مقابلے میں جہاد پر آمادہ کیا۔ ان کے ارشاد پر احمد شاہ ابدالی کابل سے روانہ ہوا۔ پوٹھوہار سے سلطان مقرب خان اپنے تیس ہزار شمشیر گیروں کے ساتھ ابدالی کے لشکر میں شامل ہوا تھا اور پھر پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی جس میں ایک لاکھ مرہٹے جہنم رسید ہوئے۔ ہیر کے مصنف وارث شاہ نے اس فتح کا حال یوں لکھا ہے ۔

جل پاڑ کے ساڑ کے فتح پائی لگیاں ہیر نوں ملن ودھائیاں نیں
فوجاں شاہ دیاں وارثا مار متھرا مُڑ پھیر لاہور نوں آیاں نیں

اس معرکہ نے کفر کا سارا کس بل نکال دیا مگر ابدالی تختِ دہلی پر رونق افروز نہ ہوا اور مراجعت کے وقت لاہور کو خدا کے حوالے کر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرہند اور لاہور کے اردگرد سکھ درندے زور پکڑنے لگے۔ اک بار پھر دین اسلام کو خطرہ پیدا ہوا۔ احمد شاہ چھ مرتبہ سکھوں کی سرکوبی کے لئے حملہ آور ہوا مگر کفار کی سرکوبی کے بعد واپس جاتا رہا۔ اسے یہاں مسلمانوں کی مستحکم حکومت قائم کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

آخر سکھوں نے گکھڑوں کی سرحدوں پر بھی تجاوز کرنا شروع کیا اور انہوں نے جیلے بہانے سے

اس جبری قبیلہ کے ان سرداروں کو بھی توڑ لیا جو متھرا سے واپسی پر سلطان مقرب خان کے ساتھ تھے۔ ان میں ہمت خان ڈومیلی والا اور نوازش علی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر چوہدری بوڑہا دھنی والے کو اکسایا۔ تاہم یوسف خان نے بعد کو معافی مانگ لی اور سلطان مقرب نے اس کا عہدہ بحال رکھا۔ لیکن اس کی کدورت دور نہ ہوئی اور وہ ہمت خان اور نوازش علی کو سلطان مقرب خان کے خلاف آمادۂ پیکار کرتا رہا۔

گجرات کے باہر سکھوں کے خلاف خونریز معرکہ ہوا۔ سکھوں کا سردار گوجر سنگھ بھنگی تھا۔ ہمت خان اور نوازش علی جو بظاہر از راہ منافقت سلطان کے لشکر میں شامل تھے موقع پا کر سلطان کو شہید کر ڈالا اور اپنے فوجی دستوں کو لے کر میدان سے بھاگ گئے۔

گکھڑ فوج سلطان مقرب خان کی شہادت کے بعد جم کر مقابلہ نہ کر سکی اور پسپا ہو گئی۔

سلطان مقرب کا کردار شمالی ہند میں اسی طرح کا ہے جو اسلام کی بقا کے لئے سلطان فتح علی ٹیپو کا جنوبی ہند میں تھا اور ہمت خان اور نوازش علی اس خطہ کے میر جعفر اور میر صادق تھے۔

ایک اور روایت ہے کہ سلطان فتح علی ٹیپو کے والد حیدر علی گھوڑوں اور دھنی کے بیلوں کا بیوپار کرتے ہوئے پوٹھوہار سے جنوبی ہند گئے اور سلطنتِ میسور کی بنیاد رکھی لیکن اس روایت کی تصدیق کسی تاریخ سے نہیں ہوتی۔

جنگ گجرات کے بعد گکھڑ سلطنت متزلزل ہو گئی اور مختلف سکھ سرداروں نے گکھڑوں پر مظالم کا آغاز کیا۔ گکھڑوں کے سر کی قیمت ایک روپیہ رکھ دی۔ اس طرح کئی شہزادے رئیس اور جیالے افراد مارے گئے۔ عورتوں کی سر راہے بے حرمتی کی گئی۔ انہیں غلام بنا کر ماجھا۔ مالوا اور لاہور بھیجا گیا۔ اس قیامت خیز دور میں گکھڑ اور ان کے حلیف افراد ذاتیں بدل بدل کر ادھر ادھر بھاگے سلطان مقرب خان کے خاندان کا کوئی حامی نہ رہا۔ جن لوگوں نے مخبریاں کیں انہیں انعامات اور

جاگیریں عطا ہوئیں۔ خاص طور پر رحمت خان نوازش علی اینڈ کمپنی کی بہت عزت افزائی ہوئی۔

عین ممکن ہے کہ اس دورِ استبداد سے بچ نکلنے کی خاطر گکھڑوں نے ککر۔ کاکر۔ کھوکر۔ ککے اور کھکے وغیرہ نام اختیار کر لئے ہوں۔

اس دارو گیر کے فوراً بعد ایک اور مصیبت نازل ہوئی کہ انگریزوں سے بیعنامہ امرتسر کی رو سے گلاب سنگھ ڈوگرہ جموال نے ۷۵ لاکھ روپے میں جموں و کشمیر کا سودا کر لیا اور بقول حکیم اُمت علامہ اقبالؒ سے

قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

مجموعی طور پر اس سودے میں شاہراہِ اعظم کے شمال جنوب پوٹھوہار کا علاقہ بھی اس کے ہاتھ آیا۔ گکھڑوں کے مشہور قلعے سلطان پور منگلا دانگلی اور رہپروالہ کے علاوہ پلاکھر میں مشہور سلاطین کے مزار بھی ڈوگروں نے قبضالئے۔ گلاب سنگھ نے اپنے آباؤ اجداد پر سلطان آدم خان کے بیٹے لشکر خان کے حملے کا بدلہ یوں لیا کہ گکھڑوں کی فی سر ایک روپیہ قیمت لگائی اور حکم دیا کہ خیر پور گاڑ۔ کاہرو۔ کہو۔ پلکھی۔ تحصیل کہوٹہ ہری پور ایبٹ آباد کے جس علاقہ سے کم از کم ۵۰ سر روزانہ رجسٹر میں درج نہیں ہوں گے اس پر تاوان ڈالا جائے گا۔

اس دوہری ستم کوشی کی وجہ سے رہے سہے گکھڑ خاندان بھی اپنی ذات بدلنے پر مجبور ہو گئے اور حکمران خاندان کے سوا جو ڈوگروں کی قید میں تھا بقیہ گکھڑوں نے ادنیٰ ترین دھندے اختیار کر لئے۔

گلاب سنگھ کا دور پوٹھوہار کی تاریخ کا پر آشوب اور تعفن سے بھرپور دور ہے جس میں ہر سمت گدھ ہی گدھ اڑتے دکھائی دیتے تھے گکھڑوں کے سلطان پور دانگلی اور رہپروالہ کے مشہور قلعوں کو کھنڈر بنا دیا گیا۔ سلاطین کے مزاروں پر ہل چلا دیئے۔ صرف منگلا تغلو اور رتھروچی کے قلعوں کو اپنی فوجی ضرورتوں کے تحت کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

سلطان مقرب خان کے بیٹے شادمان خان اور پوتے مدد خان اور اس کے خاندان کو قلعہ ریاسی میں قید رکھا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گیئں۔ یہاں تک کہ وہ وہیں وفات پا گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ شادمان خان کی قبر کے اردگرد زنجیر ڈلوادی اور کتبہ لگوادیا۔

"یہاں گکھڑ سلطان شادمان خان دفن ہے۔ اس کی
قبر کے گرد زنجیر اس لئے ڈالی گئی ہے کہ اس کی روح آزاد
نہ ہوجائے"۔

شادمان خان کا بیٹا حیات اللہ خان قید کے دوران پیدا ہوا اور وہ ۵ برس کی عمر میں ۱۸۴۸ء میں ایبٹ آباد باؤنڈری کمشنر کی مداخلت سے اس وقت رہا ہوا جب دریائے جہلم کے وہ مغربی کنارے جواب تحصیل جہلم کہوٹہ، مری، ہری پور کا حصہ ہیں، معاہدہ کی رو سے انگریزوں نے اپنی عمل داری میں شامل کرلئے۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل تک پوٹھوہار میں سکھاشاہی رہی۔ یہ گکھڑوں اور مسلمانوں کے لئے جہاں سوزی کا دور تھا۔ یہ دور اتنا کربناک تھا کہ پوٹھوہار کے مسلمان تو کیا خود ہندو اور سکھ بھی ہری ہری پکار اٹھے۔

پھر جونہی شمالی ہند کی طرف انگریزوں نے پیش قدمی کی تو اس خطہ کے نامور خاندان گکھڑوں راجپوتوں، اعوانوں، جودھوں، جنجوعوں اور خود ہندو سکھوں نے بھی خالصہ راج کے خلاف ان کا ساتھ دیا۔ آج جب ہم ان قوموں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں تو ان لوگوں کو بھول جاتے ہیں جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سکھوں کا ساتھ دیا تھا۔ یہ قومیں انگریز نے نہیں بلکہ تاریخ کی بنائی ہوئی ہیں۔ انگریزوں کی تخلیق وہ افراد اور خاندان ہیں جو، ہم تک ان کے وفادار رہے ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔

اس کے بعد انگریزوں کے خلاف مانڈلہ کے نادر خان نے صدائے حریت بلند کی۔ اس کا ساتھ

پوٹھوہار کے مختلف قبائل نے ریاحن میں ڈھونڈ، ستی اعوان اور دھنیال شامل تھے۔ نادر خان کو شیر خان جاکری والے اور رتن چند سید پور والے کی مخبری سے مارگلہ کی پہاڑیوں سے گرفتار کر کے توپ سے اڑا دیا گیا۔ بھروال خاندان اک بار پھر زیر عتاب آ گیا۔

تحریکِ ریشمی رومال اور تحریک خلافت میں بھروالہ کے راجہ کرم داد خان، مولانا عبدالرحمن اور دیگر کئی زعماء کے نام آتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران آئی این اے کی تحریک کے دوران پوٹھوہار کے جیالوں نے انگریزوں کے خلاف کئی کارنامے دکھائے ان جیالوں کے سرخیل ایم زیڈ کیانی ہیں۔ پھر تحریک پاکستان میں پوٹھوہار کے نامور فرزندوں راجہ حسن اختر، راجہ کالا خان، چوہدری ظفر الحق۔ راجہ سید اکبر، راجہ سرفراز خان۔ راجہ خیر مہدی، شیخ محمد عمر، محمود احمد منٹو، شیخ قدیر، میاں حیات بخش اور قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے دوسرے جانثار پروانوں کو کون بھول سکتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد پوٹھوہار کے غیرت مند فرزند افواج پاکستان کی لاج رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ خطہ شمشیرِ پاکستان کہلانے کا حق رکھتا ہے۔ جہادِ کشمیر میں بھی جس کے کمانڈر انچیف جنرل ایم زیڈ کیانی تھے اس خطہ کے بہادروں نے ہر محاذ پر ہندوستانی فوجوں کے چھکے چھڑائے۔

شمشیر و سنان کی روایات کے علاوہ علم و ادب کے میدان میں بھی یہ خطہ کبھی پیچھے نہیں رہا۔ نامور مفکرینِ اسلام جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ علم و عرفان کی شمعیں روشن کرتے اسی خطہ سے گذرے پوٹھوہار کے معلموں کو مغل شاہ زادوں کی آتالیقی کا شرف حاصل رہا۔ جن دنوں شہزادہ خرم (شاہجہان) رہتاس میں مقیم تھا اورنگ زیب عالمگیر کی ابتدائی تعلیم کے لئے ملا عبداللطیف سلطان پوری کو مقرر کیا گیا تھا جو ۱۰۳۲ھ سے ۱۰۳۶ ہجری تک پڑھاتے رہے۔ حضرت ملا کا مکتب سلطان جلال خان کی سرپرستی میں سلطان پور میں قائم ہوا۔ جہاں دور دور سے طلبا تحصیل عالم کی خاطر آتے رہتے۔ اس کی علاوہ حضرت بری شاہ لطیف کا مدرسۂ علوم اور شاہ مراد کا مکتب بھی محتاج تعارف

نہیں۔ ۱۰۸۰ ہجری کے لگ بھگ سلطان شادمان خان مغل دربار میں ملک الشعراء تھا۔ ان کا دیوانِ شادمان طبع ہو چکا ہے۔ ان کے اشعار میں سعدیؒ اور حافظؒ کا رنگِ سخن جھلکتا ہے۔ یہ وہی شادمان خان ہیں جنہوں نے ۱۶۵۰ء کے لگ بھگ ہوا میں پرواز کا تجربہ کیا۔ تاریخی اعتبار سے شادمان خان ہی دنیا کا پہلا ہوا باز تھا۔ قریب قریب اسی عہد میں رائے زادہ مُنی چند نے کیگوھر نامہ تصنیف کیا وہ فارسی نظم کا مانا ہوا استاد گزرا ہے۔

سلطان مقرب خان نے بھی فارسی اشعار کہے۔ وہ حامی تخلص کرتے تھے ان کا قلمی "دیوانِ حامی" امپیریل لائبریری لندن میں موجود ہے اسی زمانے میں شاہ مراد بھی اردو پنجابی اور فارسی کے شاعر تھے۔

حضرت میاں محمدؒ نے درکالی ماموری (تھانہ کلر) میں حضرت بگا شیرؒ کے مزار کے قریب اپنا درس جاری کیا، وہاں چلہ کشی کی اور وہیں اپنی کتابیں تحفۂ میراںؒ، نیرنگ عشق اور ہدایت المسلمین وغیرہ لکھیں۔

اس صدی کے اوائل میں حضرت پیر سید مہر علی شاہ کا عارفانہ کلام اور تصوف کی خانقاہ عالیہ اور دینی علوم کا مدرسہ اور لنگر محتاجِ تعارف نہیں۔

پوٹھوہار کا خطہ شمالی ہند میں مسلمانوں کا مضبوط قلعہ رہا ہے۔ آج یہ پاکستان کا بازوئے شمشیر زن ہے۔ اس کے ہر ذرے میں شجاعت، سخاوت، علم و عرفان، شعر و ادب، اسلامی تہذیب و ثقافت اور لازوال حسن عیاں ہے ـــــ اس خطے کے تاریخی، تہذیبی ثقافتی دینی اور روحانی ورثہ کو عزیز ملک نے انتہائی دلچسپ اسلوبِ نگارش میں پیش کیا ہے۔ تاریخ کسی کی میراث نہیں۔ یہ ماضی کے حالات سینہ بہ سینہ روایات۔ لوک کہانیوں، خطوط، خاندانی دستاویزات۔ آلاتِ حرب اور رہن سہن کے اطوار سے مورخ یا لکھنے والے کی عقل و دانش اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت پر مبنی ہے۔

یہ کتاب عزیز ملک کی شبانہ روز عرق ریزی اور تحقیق کا نتیجہ ہے جو یقیناً قابلِ ستائش

ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب تاریخ کے طالب علم کے لئے شمالی ہند کی تاریخی سرگزشت کو سمجھنے میں معاون اور عام قاری کے لئے دلچسپ اور سود مند ثابت ہو گی۔

کرنل سلطان ظہور اختر

حوالے

۱. تزک بابری (اردو)
۲. ہمایوں نامہ (گلبدن بیگم)
۳. ابنِ خلدون۔
۴. تاریخ فرشتہ۔
۵. تزک جہانگیری۔
۶. گیگوھٹ نامہ (مرتبہ ڈاکٹر باقر)
۷. مہر منیر (مرتبہ مولانا فیض احمد فیض)
۸. ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک (عبدالسلام ندوی)

1. A GUIDE TO TAXILA (JOHN MARSHAL)
2. MIRZA KAMRAN (IBTEDAR ALAM KHAN)
3. PUNJAB DISTT GAZETTIERS
4. PUNJAB CASTES (SIR DENZIL IBISTIN)
5. PUNGAB MUSLMAN (LT CON I.M. WIKELEY)
6. THE AFGAANS IN INDIA (M.A. RAHIM)
7. ANCIANT INDIA (B.G. GOKHLE)
8. ASOKA (VINCIANT A, SMITH)
9. A HISTORY OF INDIA (ROMILA THAPER)
10. DISCOVERY OF INDIA (JAWAHAR LALL NEHRU)
11. HISTORY AND PHILOSOPHY OF SIKHS (KHAZAN SINGH)

12. FIVE THOUSAND YEARS OF PAKISTAN.

(RE.M. WHEELER)

13. CULTURAL REPORT NO, 9.

14. CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA (WOLSELEY HAIG)

15. HISTORY OF INDIA (VINCANT. A. SMITH)

16, RANJIT SINGH (KHUSH WANT SINGH)

17. THE REAL RANJIT SINGH (FABIR WAHIDUDDIN)

18. REIGNING FAMILY OF LAHORE

(MAJ. G. CARANCHEEL SANTH)

19, INDIA AND PAKISTAN (SIR MORTIMER WHEELEN

20, GAKHAR (G.G. DELMERICK

21. HISTORY OF CIVILISATION (WILDURANT)

22. HISTORYANS HISTORY OF THE WORLD

(HENERY WILLIAMS)

TO-CS-7811-Oii

POTOHAR

Chief Editor : Uxi Mufti

Editor : Mazhar-ul-Islam

Research
Translation : Aziz Malik

Cover Design : Masood Akhtar

Calligraphy : M. Aslam Cheema

First published 1978 by Institute of Folk Heritage, Islamabad.

Printed at Printlineline Publishers 18-A, Shadman Colony, Jail Road Lahore

IFH

POTOHAR (Literally ... ed terrain), portrays the geographical milieu a the way of life of the region encomp ng Islamabad, Rawalpindi, Jhelum; etc. To understand the cultural back ground of this fairly populous area of Pakistan one has to understand two essential components, the idealogical back-ground and the climate. Aziz Malik, the author and one of the important writers of the country, has viewed the folklore of Potohar historically and through the orally transmitted traditions.

As usual the book is another addition to the series of cultural surveys undertaken by the Institute of Folk Heritage.